ارمغان حجاز با شرح

(مکمل اردو)

یوسف سلیم چشتی

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۳۶۴۳، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

بارِ اوّل جنوری ۱۹۸۲ء

تعداد پانچ سو

زیرِ نگرانی اعتقاد حسین

طباعت نیو لیتھو آرٹ پریس دہلی

قیمت :- ۱۲/- روپے

سول ایجنٹ

(۱) عثمانیہ بک ڈپو ۱۰۴ لور چیت پور روڈ کلکتہ ۱

(۲) اردو لائبریری سینٹر ۳۷ سٹی مارکیٹ بنگلور ۲

(۳) جاوید بک ڈپو ۶/۷ کولو ٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مُقَدّمہ

اِس حصّہ میں علامہ اقبال مرحوم کا وہ اُردو کلام مندرج ہے جو انھوں نے ۱۹۳۶ء سے لے کر اپنی وفات سے کچھ دنوں پہلے تک موزوں کیا۔

اس حصّہ میں کوئی غزل نہیں ہے اور نہ کسی نظم میں رنگِ تغزّل پایا جاتا ہے۔ کلامِ اقبال کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ غزلوں کا دور ۱۸۹۳ء سے شروع ہو کر ۱۹۲۳ء میں ختم ہو گیا۔ چنانچہ ضربِ کلیم میں تغزّل اور شعریت بہت کم ہے۔ یہ انقلاب اس حقیقت پر دال ہے کہ زندگی کے آخری دور میں اقبال کی شاعری پر فلسفہ غالب آ گیا تھا۔

اس حصّہ میں دو نظمیں فارسی زبان میں ہیں۔

مرحوم نے اُنہیں اُردو حصّہ میں اس لئے شامل کیا۔ کہ ارمغان (حصّہ فارسی) میں شامل نہیں ہو سکتی تھیں۔

اس حصّہ کے اجزائے ترکیبی حسبِ ذیل ہیں:-

(ا) شروع میں آٹھ نظمیں ہیں۔ اور ان نظموں میں چھ تمثیلیں ہیں۔ اس لئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مرحوم چند سال اور زندہ رہ جاتے۔ تو وہ ملٹن (MILTON) کی طرح خالص تمثیلی شاعری اختیار کر لیتے۔

(ب) اس کے بعد تیرہ رباعیات ہیں۔ جن میں سے بعض میں وحدۃ الوجود کا رنگ پایا جاتا ہے۔

(ج) ان کے بعد ملّا زادہ ضیغم لولابی کا بیاض ہے۔ اس میں سترہ نظمیں ہیں اور دو شعر ہیں۔

(د) آخر میں متفرق نظمیں ہیں جن میں سے دو نظمیں دو اشخاص کے نام ہیں اور آخری نظم میں حضرتِ انسان کے منصب اور مقام کو واضح کیا ہے۔

اس مختصر مقدمہ کے بعد کتاب شروع کرتا ہوں۔

تمہید

نظمِ اوّل

یہ تمثیلی نظم اُردو ادب کے شاہکاروں میں سے ہے۔ باکرانی نوعیت، اسلوبِ بیان، "حقیقت نگری" کے رفعتِ تخیل، وسعتِ مضامین، زورِ کلام، ژرف نگاہی، اور کمالِ تنقید کے لحاظ سے خود اقبال کی تمام تمثیلی نظموں میں بے مثل ہے۔ جس طرح نثر کے مقابلہ میں نظم کا مرتبہ، اثر آفرینی کے اعتبار سے فزوں تر ہے، اسی طرح اصنافِ نظم میں تمثیل کو فوقیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اکثر نامور اربابِ قلم نے اس صنف کی مدد سے اپنے خیالات کو مؤثر ترین پیرایہ میں لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ مثلاً افلاطون نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "جمہوریت" میں غار کی تمثیل کے پردہ میں اپنے بنیادی فلسفہ کو بیان کیا ہے۔ اور شیخ فریدالدین عطارؒ نے اپنی مشہور تصنیف "منطق الطیر" میں یہی اسلوبِ نگارش اختیار کیا ہے۔ انگریزی ادب میں، پلگرمس پراگریس، تمثیلی شاعری کی بہترین مثال ہے۔

تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ اس میں شاعر اپنا مافی الضمیر کنایات اور استعارات کے ذریعہ سے بیان کرتا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اس تمثیلی نظم کا مرکزی خیال یہ ہے۔ کہ اقبال مسلمانوں کو اس حقیقت سے

آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ کہ دنیا میں اگر کوئی نظامِ حیات یا دستورِ عمل، ابلیسی نظام کو شکست دے سکتا ہے، تو وہ اسلام ہے۔ چونکہ ابلیس اس نکتہ سے واقف ہے۔ اس لئے وہ اس دین کو فنا کرنے پر کمربستہ ہے۔ اندریں حالات مسلمانوں کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ اپنی تمام قوتیں ابلیسی نظام کو تہہ و بالا کرنے پر مبذول کر دیں۔

ناظرین غور کریں کہ بات صرف اسی قدر ہے جسے میں نے ...... تین مختصر جملوں میں بیان کر دیا ہے۔ یہی اس ساری نظم کا خلاصہ ہے۔ لیکن اقبال کا کمالِ فن دیکھئے کہ انھوں نے اس تصور کو تمثیل کا لباس پہنا کر ایسے دلکش انداز میں پیش کیا ہے کہ رُوح وجد کرنے لگتی ہے۔ جو اثر اس نظم کے مطالعہ سے دل میں پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ نثر کے سو صفحات سے بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

اب میں ناظرین کی سہولت کے لئے اس نظم کا تجزیہ کرتا ہوں۔

پہلے بند میں ابلیس مشیروں کے سامنے اپنے قائم کردہ نظام کی خصوصیات بیان کرتا ہے۔ اور آخر میں فخریہ انداز میں یہ دعویٰ کرتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں مٹا سکتی۔

ع کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں

دوسرے بند میں پہلا مشیر ابلیس یعنی قائدِ ایوان کے دعویٰ کی تائید کرتا ہے۔ کہ بلا شبہ دنیا کی کوئی طاقت اس نظام کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ پہلے مشیر کی تقریر سُن کر دوسرا مشیر اس سے اختلافِ رائے ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے مبادا جمہوری نظام، ہمارے ابلیسی نظام کو باطل کر دے۔

تیسرے بند میں پہلا مشیر، دوسرے مشیر کے شبہ کا ازالہ کرتا ہے کہ جمہوری نظام

چونکہ ہمارا ہی پیدا کردہ ہے۔ اس لئے اس کی طرف سے ہمیں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

ع جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اُس سے خطر

چوتھے بند میں تیسرا مشیر، پہلے کے خیالات کی تائید کرتا ہے۔ لیکن یہ اندیشہ ظاہر کرتا ہے کہ شاید اشتراکیت ہمارے نظام کو فنا کر دے۔

پانچویں بند میں چوتھا مشیر، تیسرے مشیر کے شبہ کا ازالہ کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اشتراکی نظام کو ختم کر دینے کے لئے ہم نے فاشسلی نظام پیدا کر دیا ہے۔ یہ سُن کر تیسرا مشیر چوتھے مشیر کی تردید کرتا ہے کہ فاشسلی نظام اشتراکی فتنہ کو فنا کر دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لئے ہمیں آخر الذکر فتنہ سے غافل رہنا مناسب نہیں ہے۔

چھٹے بند میں پانچواں مشیر، تیسرے مشیر کی تائید کرتا ہے اور ابلیس کو مخاطب کر کے زوردار الفاظ میں یہ کہتا ہے، کہ واقعی اشتراکیت ہمارے نظام کے لئے سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اس لئے اس کا تدارک ہمارا اوّلین فرض ہے۔

میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

پانچوں مشیروں کی تقریریں اور خیالات سُننے کے بعد ابلیس آخری تقریر کرتا ہے۔ اس کی اس معرکۃ الآرا تقریر کے تین حصے ہیں۔

اپنی تقریر کے پہلے حصہ میں یعنی نظم کے چھٹے بند میں ابلیس یہ کہتا ہے۔ کہ میں اشتراکیوں سے مطلق خوفزدہ نہیں ہوں۔

ع کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
ہاں اگر مجھ کو کوئی خطرہ ہے تو مسلمانوں سے ہے۔

دوسرے حصہ میں یعنی ساتویں بند میں وہ اسلام کی وہ خصوصیات بیان کرتا ہے جن کی بنا پر اُسے اپنے نظام کی شکست کا اندیشہ لاحق ہے۔

تیسرے حصہ میں یعنی آٹھویں بند میں وہ اپنے مشیروں کو یہ حکم دیتا ہے کہ چونکہ ہمیں صرف اسلام سے خطرہ ہے، اس لئے تم سب مل کر یہ کوشش کرو کہ مسلمان اسی طرح اسلام سے بیگانہ رہے جس طرح ایک ہزار سال سے بیگانہ چلا آرہا ہے۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں اس نظم کے ہر شعر کا مفہوم آسان لفظوں میں واضح کرتا ہوں۔ اور آخر میں پوری نظم پر تبصرہ کروں گا۔ تاکہ ناظرین کو اقبال کے اُن بنیادی افکار سے آگاہی حاصل ہو جائے۔ جو انھوں نے اِس تمثیل کے پردہ میں بیان کئے ہیں۔

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

۱۹۳۶ء

ابلیس

یہ عناصر کا پُرانا کھیل! یہ دُنیائے دوں!
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں!
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں
میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں!
کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں
جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں؟

تمہید: شیکسپیر نے اپنے مشہور ڈرامہ (TWELFTH NIGHT) کا آغاز اس جملے سے کیا ہے: "اگر یہ سچ ہے کہ موسیقی عشق کی غذا ہے۔ تو مجھے یہ غذا اتنی زیادہ مقدار میں دو کہ میں کھاتے کھاتے اکتا جاؤں" سچ یہ ہے کہ یہ ایک ہی جملہ قائل کی پوری سیرت کا آئینہ دار ہے اسی طرح اقبال نے اس نظم کی ابتدا اس مصرع سے کی ہے۔

"یہ عناصر کا پرانا کھیل! یہ دنیائے دوں!"

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ دو لفظوں میں ابلیسیت کی پوری روح کھینچ کر رکھ دی ہے۔ دنیا کو "عناصر کے پرانے کھیل" سے تعبیر کرنا ابلیس کی تعلیمات کا سنگِ بنیاد ہے کیونکہ ابلیسیت کی تمام صورتیں اسی تصور سے پیدا ہوتی ہیں۔ کہ دنیا عناصرِ مادی کا پرانا کھیل ہے۔

سانکھ درشن، چارواک مت، جین دھرم، بودھ دھرم، دیمقراطیسی نظام، لاادریت، تشکیک، دہریت، الحاد، زندقہ، مادہ پرستی، فرویکیت، مارکسزم، انارکسزم، نہلزم، پازیٹوزم، ڈی ازم، ہیومینزم، بالشوزم، سوشلزم، اور کمیونزم، اور اسی قبیل کے دوسرے ازموں کی بنیاد یہی ہے۔ کہ یہ دنیا عناصرِ مادی کا پرانا کھیل ہے۔

"پرانا کھیل" غور طلب ترکیب ہے۔ اقبال نے پوری مادیت کو دو لفظوں میں بند کر دیا ہے۔ واضح ہو کہ مادیت کی تعلیم یہ ہے۔ کہ دنیا سالماتِ مادی کے غیر شعوری اور ازلی امتزاج کا نتیجہ ہے۔ بالفاظِ واضح تر۔

۱۔ تجارب اور تنافر سالمات کا جذب باہمی یا اس کے برعکس عمل کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ ایک اندھی طاقت ان سالمات کو ملاتی رہتی ہے۔ اور ان کے بلا مقصد امتزاج سے مختلف چیزیں بنتی رہتی ہیں۔

۲۔ یہ کھیل پرانا ہے۔ یعنی مادہ ازلی ہے۔ اس کی کوئی ابتدا نہیں ہے

جن لوگوں نے مسلکِ مادیت کا مطالعہ کیا ہے۔ ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے۔ کہ اس مسلک کی بنیاد انہی دو باتوں پر ہے۔ اگر اس نکتہ کو مدِ نظر رکھ کر اس مصرع کو پڑھا جائے۔ تو اس کی موزونیت بخوبی واضح ہو سکتی ہے۔

"ساکنانِ عرشِ اعظم" کنایہ ہے فرشتوں سے، جو اس دنیا میں خلافت و نیابتِ الٰہیہ کے امیدوار تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے، جب حضرت آدمؑ کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا تو ان کی تمناؤں کا خون ہو گیا۔

ابلیس اپنے مشیروں سے کہتا ہے۔ کہ دنیا جو بذاتِ خود ذلیل اور کمینہ ہے (اسی لئے ذلیل اور کمینہ خصلت لوگوں پر نگاہِ کرم مبذول کرتی ہے) اور جس پر فرشتے حکم رانی کی آرزو رکھتے تھے۔ لیکن ناکام رہ گئے۔ اس دنیا کو وہ "کارساز" برباد کرنے پر تلا ہوا ہے جس کا دعویٰ یہ ہے کہ میں نے اس کو کلمۂ کُن سے پیدا کیا ہے اور اسی لحاظ سے اس کا نام جہانِ کاف و نون رکھا تھا۔

شاید آپ حضرات دریافت کریں کہ میں نے کن آثار و قرائن سے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ کہ خدا اس دنیا کی بربادی پر آمادہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ پہلی جنگِ عظیم نے جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک برپا رہی، آئندہ جنگوں کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب دوسری جنگ برپا ہو گی، جو اپنی ہولناکی کے اعتبار سے گزشتہ جنگ پر فوق لے جائے گی۔ اگر اسی طرح جنگوں کا سلسلہ قائم رہا۔ تو ایک دن ایسا بھی آجائے گا۔ جب میرے تمام متبعین صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ لیکن میں آپ صاحبان کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں خدا کو ہرگز اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ یہ سچ ہے کہ خدا ان تمام

ا۔ ابلیس اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا کہ یہ دنیا کلمۂ کُن سے پیدا ہوئی ہے۔ اسی لئے وہ یہ کہتا ہے کہ اس کار ساز نے اس کا نام جہانِ کاف و نون رکھا تھا۔

اقوام کو جو میرے زیرِ اثر ہیں (مثلاً روس، انگلستان، امریکہ، فرانس، اطالیہ، ہالینڈ وغیرہ) دنیا کو نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے۔ اور ان کے بجائے ایسی قوم پیدا کرنی چاہتا ہے۔ جو اس کی پرستار ہو۔ لیکن میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔ کیونکہ میں نے اپنا یہ نظام بڑی محنت اور جانفشانی کے بعد قائم کیا ہے۔ اور اس نظام کی شراب کو مختلف رنگ کی بوتلوں میں پیش کیا ہے مثلاً۔

(ا) یورپ کی اقوام کو ملوکیت (IMPERIALISM) کی تعلیم میں نے ہی تو دی ہے۔ برطانوی کامن ویلتھ کے ارکان جس ملکۂ معظمہ کی صحت کا جام نوش کرتے ہیں وہ میرے ہی قائم کردہ نظامِ ملوکیت کی نگراں ہے۔

(ب) عوام الناس کے دلوں سے مذہب (مسجد، دیر، کلیسا) کا احترام میں نے ہی زائل کیا ہے۔ اسلامی ممالک کے باشندے شریعتِ اسلامیہ کا استخفاف میرے ہی باطنی اشارے پر تو کر رہے ہیں۔ میری ہی تلقین کا تو یہ اثر ہے کہ عورتیں بے حیائی اور بے حجابی کو وہ ترقی سے تعبیر کرتی ہیں اور اس غیر اسلامی طرزِ عمل کو خوب اچھے انداز میں دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔ میں نے ہی تو ان کے کان میں یہ افسوں پڑھ کر پھونک دیا ہے۔ کہ اگر یورپ کی عورتوں کی تقلید کرو گی تو تمہاری قوم ترقی کی بلند ترین منزل پر پہنچ جائے گی۔ چنانچہ وہ دن دور نہیں جب ان ملکوں میں بھی عریانی کے کلب قائم ہو جائیں گے۔ اور

(ج) مفلسوں، مزدوروں، فاقہ کشوں، اور کاشتکاروں کو میں نے ہی تو تقدیر کا سبق پڑھایا ہے۔ کہ زمینداروں اور جاگیرداروں کی غلامی کرتے رہو۔ اگر وہ تمہاری بیٹی کی عصمت ریزی کریں تو صبر کرو۔ اگر تمہاری بیوی کو غائب کر دیں تو چپ رہو۔ اگر تمہارے گھروں کو آگ لگوا دیں تو اُف مت کرو۔ کیونکہ تمہاری تقدیر ہی میں یہ باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ تقدیر کے اس غلط

مفہوم نے دنیا کے ناداروں کو قوتِ عمل سے محروم کر دیا۔ گویا شیروں کو بکریاں بنا دیا۔

(د) دولتمندوں کے دلوں میں سرمایہ داری کا جذبہ بے پناہ میں نے ہی تو پیدا کیا ہے۔ کہ یہ لوگ رات دن دولت جمع کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کے حصول کے لئے جائز اور ناجائز، حرام اور حلال، حق اور ناحق، جھوٹ اور سچ میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔

حضرات آپ غور کریں کہ میں نے کتنی محنت اور جانفشانی سے ملوکیت، دہریت (مادہ پرستی) تقدیر پرستی اور سرمایہ داری یہ چار ادارے قائم کئے ہیں! کیا میں خدا کو اس بات کی اجازت دے دوں گا۔ کہ وہ ان درختوں کو جو میں نے ہزاروں سال کی محنت کے بعد پروان چڑھائے ہیں (اور اب ان کے اثمارِ شیریں سے بہرہ اندوز ہونے کا وقت آیا ہے) بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دے اور ان کی جگہ چودہ سو سال کا پرانا نظام دوبارہ قائم کر دے؟ چنانچہ میں آپ صاحبان کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمارے نظام کو باطل نہیں کر سکتی۔

پہلا مشیر

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!
طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوّالی سے کچھ کمتر نہیں علمِ کلام
ہے طوافِ و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام
کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمانِ جدید؟
"ہے جہاد اس دور میں مردِ مسلماں پر حرام!"

ابلیس کی تقریر سُن کر اُس کے پہلے مُشیر نے اُس کی تائید ان الفاظ کی کہ بلاشبہ آپ کا قائم کردہ نظامِ زندگی بہت مستحکم ہے۔ اور اس کے استحکام کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے۔ کہ اس کی بدولت عامۃ الناس غلامی میں پختہ تر ہو گئے۔ اس شعر میں "پختہ تر" غور طلب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہر دور کے قیاصرہ، اکاسرہ، فراعنہ، نمارِدہ اور دیگر ملاعنہ نے انسان کو غلامی میں پختہ کیا اور ابلیس نے اس "کارِ خیر" میں ان بادشاہوں کی ہر ممکن طریق سے امداد کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام غلامی میں پختہ سے پختہ تر ہو گئے۔

اس کے بعد پہلا مُشیر غلاموں کی نفسیات کی تشریح کرتا ہے کہ عامۃ الناس تو ابتدائے آفرینش سے ملوک پرستی میں مبتلا رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ہر دَور میں اپنے بادشاہوں کو "ظل اللہ" کا شاندار لقب دے کر اُن کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہے۔ عوام کی فطرت ہی ایسی ہے۔ کہ وہ بادشاہوں کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے ہیں۔ یعنی اطاعت پر کمر بستہ رہتے ہیں۔

"نماز بے قیام" بڑی بلیغ ترکیب ہے۔ یعنی غلاموں کی نماز میں نہ قیام ہے نہ رکوع، نہ جلسہ بلکہ از اوّل تا آخر سجدہ ہی سجدہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ غلاموں کی پوری زندگی سجدہ (اطاعت) ہی میں گذر جاتی ہے۔

آزادی کی آرزو اوّل تو اِن کے دل میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر کسی شوریدہ سر کی کوششوں سے پیدا ہو بھی جاتی ہے۔ تو ابلیسی نظام کی "برکت" سے یا تو فنا ہو جاتی ہے۔ یا ایسی مضمحل ہو جاتی ہے۔ کہ وہ لوگ آزادی کے لئے جدو جہد نہیں کر سکتے۔

یہ ہماری ہی مسلسل کوششوں کا نتیجہ تو ہے۔ کہ صوفی اور مُلّا جو اپنے منصب کے لحاظ سے حریت کے علمبردار ہو سکتے تھے۔ آج خود ملوکیت کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ اور اپنے پیروؤں کو غلامی کا درس دے رہے ہیں۔ اور ان کی خانقاہیں اور مدرسے آج غلامی کی سب سے بڑی تربیت گاہیں بنی ہوئی ہیں۔

اگرچہ ہماری رائے میں "علم کلام" بلحاظ نتائج آفرینی، قوالی یعنی غیر اسلامی تصوف سے کمتر نہیں ہے۔ لیکن ہم نے مشرقی ممالک کے مسلمانوں کو قوالی (غیر اسلامی تصوف) کا خوگر اس لئے بنایا ہے۔ کہ اُن کی اُفتادِ طبع کے پیشِ نظر یہی افیون ان کے لئے موزوں تھی۔

اس شعر کا مطلب یہ ہے۔ کہ غیر اسلامی تصوف اور علمِ کلام دونوں کا نتیجہ یکساں ہے۔ یعنی تصوف اور کلام دونوں، انسان کی قوتِ عمل اور ذوقِ جہاد کو مُردہ کر دیتے ہیں۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ مسلمان، علمِ کلام کے مقابلہ میں "قوالی" زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس لئے ہم نے اُسے اسی مرض میں مبتلا کر دیا ہے۔

مسلمان قوالی کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ کاہل اور عیش پسند ہے۔ محنت مشقت سے جان چُراتا ہے۔ اور علمِ کلام حاصل کرنے کے لئے اُس کو بہر حال کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ یعنی خود محنت کرنی پڑے گی۔ اور قوالی میں اُسے خود کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ رات کو کھانا کھا کر پانوں کی ڈبیہ اور بٹوہ لے کر محفل میں چلا گیا۔ اور ساری رات زبان سے واہ وا اور سبحان اللہ کہتا رہا، صبح ہوتے گھر آ کر سو گیا۔

اب اِس کی وضاحت بھی کر دوں کہ علمِ کلام سے قوتِ عمل کس طرح مردہ ہو جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ علمِ کلام میں اُن امور سے بحث کی جاتی ہے جو عقل کی دسترس سے بالاتر ہیں۔ مثلاً ماہیتِ وجود، ماہیتِ علم، ماہیتِ رُوح، ماہیتِ عالم، ربطِ حادث بالقدیم، حدوث و قدمِ کائنات، ذات و صفاتِ باری، تقدیر و تدبیر، جبر و اختیار اور مسئلہ خیر و شر وغیرہ وغیرہ یہ تمام مسائل ایسے ہیں۔ کہ نہ انسانی عقل ان کو سمجھ سکی ہے اور نہ کبھی آئندہ سمجھ سکے گی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ساری عمر ان بحثوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقت ہی نہیں مل سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی متکلم نے میدانِ جنگ میں جامِ شہادت نوش نہیں کیا۔

اس کے بعد وہ مُشیر یہ کہتا ہے۔ کہ بے شک مسلمان حج کرنے جاتے ہیں۔ لیکن یہ اجتماع دراصل محض ایک ہنگامہ ہے۔ جو چند روز کے لئے ہر سال برپا ہو جاتا ہے۔

مسلمان جن میں اکثریت بوڑھوں کی ہوتی ہے۔ ہر سال طواف کرنے چلے جاتے ہیں، لیکن اس اجتماع کے مقصد سے ہمیشہ بیگانہ رہتے ہیں۔ حجازی حکومت کا خزانہ پُر کرنے کے بعد جو رقم بچی ہے۔ اُس سے کھجوریں، تسبیحیں، جانمازیں، رومال اور آبِ زمزم خرید کر واپس آجاتے ہیں اور نہ وہ احتسابِ نفس کرتے ہیں۔ اور نہ جہاد کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

حج کا مقصد تو یہ تھا کہ ساری دنیا کے مسلمان ہر سال مرکز میں جمع ہو کر اپنے اندر اجتماعیت کا رنگ پیدا کریں۔ مسلمانانِ عالم کی بہبود کے لئے تجاویز مرتب کریں۔ اقوامِ فرنگ کے اقتدار کو ختم کرنے کی تدابیر سوچیں۔ یعنی جہاد کے لئے تیاری کریں۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہم نے وہاں بھی ملوکیت کا دام بچھا رکھا ہے۔ تو ہمیں اس سالانہ ہنگامہ سے کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔؟

آخر میں وہ مُشیر اس کارنامہ کے اظہار پر اپنی تائیدی تقریر ختم کرتا ہے کہ مسلمانوں کو جذبۂ جہاد سے بکلّی بیگانہ بنا دینے کے لئے ہم نے اپنے دوستوں کی معرفت یہ نیا فرمان جاری کر رکھا ہے کہ "ہے جہاد اس دَور میں مردِ مسلماں پر حرام"

دوسرا مُشیر

خیر ہے سُلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

پہلے مُشیر کی تقریر سُن کر دوسرے مُشیر نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ آج کل دنیا میں ہمارے

ابلیسی نظام کو تہ و بالا کر دینے کے لئے ایک نیا فتنہ پیدا ہوا ہے۔ جس سے شاید تو بے خبر ہے۔ وہ فتنہ جمہوریت کا ہے۔ یعنی بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ملوکیت کی بجائے جمہوریت کو دنیا میں فروغ دیا جائے۔ میں تجھ سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ یہ تحریک ہمارے حق میں مفید ہے یا مضر؟

میرا تو خیال یہ ہے کہ جمہوریت کا فتنہ ہمارے حق میں بہت خطرناک ہے۔

پہلا مشیر

خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے با خبر

ہوں، مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے
جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر!
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!

یہ سن کر پہلے مشیر نے جواب دیا کہ میں جمہوریت کی تحریک سے بے خبر نہیں ہوں۔

لیکن "جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اُس سے خطر؟"

اے میرے دوست! موجودہ مغربی جمہوری نظام سے ہمیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تو ہمارا ہی پیدا کردہ ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

بات یہ ہے کہ جب انسانوں میں سیاسی شعور پیدا ہوا۔ اور انہوں نے یہ کہا کہ حکومت تو عوام کا حق ہے۔ تو ہم نے ملوکیت کو جمہوریت کا لباس پہنا دیا۔ صرف نام اور شکل کا فرق ہے۔ ورنہ در اصل ملوکیت اور مغربی جمہوریت میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ نظامِ ملوکیت کا انحصار، بادشاہ یا کسی فرد کے وجود پر نہیں ہے۔ اگر ہم ملوکیت کی رُوح کو جمہوریت کے پردہ میں پوشیدہ کر دیں تو ہمارا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو! ملوکیت کی روح یہ ہے کہ زید کی محنت کا پھل اس کے بجائے کسی اور کے حصے میں آ جائے۔ بالفاظِ دگر مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار کھائے۔ چونکہ موجودہ مغربی جمہوریت میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ اس لئے پرویز کا دربار اور پارلیمان کا کاروبار دونوں یکساں ہیں۔ فرق اگر ہے تو اس قدر کہ ملوکیت میں شخص واحد غیر کی کھیتی کا مالک ہو جاتا ہے۔ اور جمہوریت میں چند دولت مند با اثر اور ذی رسوخ اشخاص مالک ہو جاتے ہیں۔ ملوکیت میں عوام فردِ واحد کے غلام ہوتے ہیں

جمہوریت میں چند افراد اُن کا معبود بن جاتے ہیں۔ یعنی دونوں صورتوں میں عوام غلامی کی لعنت میں گرفتار رہتے ہیں۔ اگر تجھے میری بات میں شک ہو تو مغرب کے جمہوری نظام کے "دستور" کا مطالعہ کر کے دیکھ لے۔

ع چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

یعنی جمہوری حکومتوں میں بھی عوام الناس پر وہی ظلم ہوتے ہیں جو شخصی حکومتوں میں ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شخصی حکومت میں "بادشاہ" ظلم کرتا ہے اور جمہوری حکومت میں یہ کام "مجلسِ ملت" انجام دیتی ہے۔

جمہوریت کا چہرہ تو ضرور روشن ہوتا ہے۔ یعنی یہ طرزِ حکومت بظاہر بہت دلکش ہے۔ کہ کوئی بادشاہ نہیں ہوتا۔ بلکہ عوام خود اپنے اوپر حکمران ہوتے ہیں، لیکن اس کا باطنی پہلو یعنی دل چنگیز سے بھی زیادہ سیاہ اور ناپاک ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوریت میں بھی شخصی حکومت کی طرح مذہب کو سیاست سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جمہوریت اور ملوکیت اپنے اعمال اور نتائج کے لحاظ سے یکساں ہو جاتی ہیں۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

چنگیز خاں جسے مؤرخین نے "عذابِ الٰہی" کا لقب دیا ہے، دنیا کے اُن ظالم بادشاہوں میں سے گزرا ہے۔ جن کو انسانوں کے قتل کرنے میں خاص لذت محسوس ہوتی تھی۔ نیرو، اٹیلا اور ہلاکو کی طرح چنگیز کا نام بھی ظلم و ستم کا مرادف ہو گیا ہے۔ یہ خونخوار وحشی سنہ ۱۱۵۵ء میں منگولیا کے ایک غیر معروف گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ سنہ ۱۲۰۶ء میں مغلوں نے اُسے اپنا خان یعنی بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اور اُس کے بعد اس نے کاشغر اور بخارا سے لے کر اصفہان اور ہمدان تک

تمام شہروں کو تباہ اور برباد کر کے رکھ دیا۔ ہلاکو خاں اسی شخص کا پوتا تھا۔ جس نے بغداد میں قتلِ عام کر کے سلطنتِ عباسیہ کا خاتمہ کر دیا۔

تیسرا مشیر

رُوحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب؟
وہ کلیمِ بے تجلّی! وہ مسیحِ بے صلیب!
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب!
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کیلئے روزِ حساب!
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب!

یہ سن کر تیسرے مشیر نے یہ کہا۔ کہ اگر جمہوریت میں ملوکیت کی رُوح باقی رہے تو پھر ہمیں اس طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ لیکن یورپ میں دوسرا فتنہ بھی تو رونما ہوا ہے جس کا نام اشتراکیت ہے۔ اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے ہمارے پاس کون کون سے ذرائع اور وسائل ہیں؟

"اُس یہودی کی شرارت" سے یہ مراد ہے کہ کارل مارکس نے ایسا نظام مرتب کیا ہے کہ اگر دنیا اُسے قبول کر لے تو ابلیسی نظام یقیناً تہ و بالا ہو جائے گا۔

"وہ کلیم بے تجلی" سے مراد یہ ہے۔ کہ اس کی تحریروں کو مزدور طبقہ اسی عزت اور عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جس نگاہ سے مذہبی طبقہ، آسمانی کتابوں کو دیکھتا ہے۔ یعنی اس شخص میں بھی پیغمبری کی شان پائی جاتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہ تجلی سے محروم ہے یعنی خدا کا منکر ہے۔ لیکن مزدور طبقہ اس کی کتاب سرمایہ پر اسی طرح ایمان رکھتا ہے جس طرح یورپ کے عیسائی بائبل پر۔

"مسیح بے صلیب" سے مراد یہ ہے۔ کہ اشتراکیت کے بانی کی زندگی بھی جناب مسیح کی طرح بہت عسرت میں بسر ہوئی اور دوسری مشابہت یہ ہے کہ اس نے بھی غریبوں اور مسکینوں کو خوش خبری سُنائی، مسیح کی طرح مارکس بھی مزدوروں اور فاقہ کشوں کا ہمدرد تھا۔ فرق یہ ہے کہ مسیح کو بقول نصاریٰ یہود نے مصلوب کر دیا۔ لیکن مارکس اس حادثہ سے محفوظ رہا۔ وہ بھی اس لئے کہ انگلستان میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔ اگر جرمنی، ہالینڈ، بلجیم، ڈنمارک، فرانس، اطالیہ، اسپانیہ میں ہوتا تو واقعی مصلوب ہو جاتا۔

اس کے بعد میرا مشیر یہ کہتا ہے کہ اگرچہ مارکس کافر ہے یعنی ابلیسی نظام کی خوبیوں کا منکر ہے (لفظ کافر لغوی معنی میں مستعمل ہے) لیکن اس میں شک نہیں کہ اُس نے مزدور اور فاقہ کش طبقہ کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اور بنی آدم کو خود شناس اور خود نگر بنا دیا ہے۔ اُس نے مزدوروں کے اندر یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ

ع کھا ئے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار؟

اس کی تعلیمات سے مشرق و مغرب دونوں جگہ قیامت برپا ہو گئی ہے صدیوں کے مُردے، خوابِ غفلت سے بیدار ہو گئے ہیں۔ اور وہ اپنے ماحول اور حالاتِ گردو پیش کا جائزہ لے رہے ہیں۔ کہ جس معاشی نظام کے تحت ہم صدیوں سے زندگی بسر کر رہے ہیں، یہ ہمارے حق میں مفید ہے یا مضر؟

اُس کی تعلیمات نے عوام النّاس کی طبائع میں اس قدر فساد پیدا کر دیا کہ غلاموں نے خلافِ توقع، خلافِ دستور اور خلافِ رسوم، اپنے آقاؤں کو حکومت سے محروم کر دیا۔ اور خود ان کی جگہ حکمراں ہو گئے۔

اس شعر میں اُس عظیم الشان انقلاب کی طرف اشارہ ہے جو ۱۹۱۷ء میں روس میں رُو نما ہوا۔ جبکہ مزدوروں نے زارِ روس کو جو اپنے وقت کا فرعون تھا، پہلے تاج و تخت سے محروم کر کے صحرائے ترکستان میں جلا وطن کیا پھر اس کو اور اُس کے تمام افرادِ خاندان کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔

چوتھا مشیر

توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ
آلِ سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب
کون بحرِ روم کی موجوں سے ہے لپٹا ہوا
گاہ بالد چوں صنوبر گاہ نالد چوں رباب

یہ سُن کر چوتھے مشیر نے تیسرے مشیر کو یہ جواب دیا کہ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

لہ کارل مارکس یہودی الاصل تھا اور جرمنی کا باشندہ تھا۔ ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا انقلابی اشتراکیت (سوشلزم) کا بانی تھا۔ حکومت نے جلا وطن کر دیا تو فرانس چلا آیا۔ یہاں سے نکالا گیا تو ۱۸۴۹ء میں لندن آیا اور تا دمِ وفات ۱۸۸۳ء تک یہیں مقیم رہا۔ اس کی کتاب سرمایہ اشتراکیوں کی نظر میں بائبل سے کم نہیں۔

ہم نے اشتراکیت کا قلع قمع کرنے کے لئے اطالیہ میں فاشزم کی تحریک پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ مسولینی (آلِ سیزر) سلطنتِ روم کی گذشتہ عظمت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

رُومۃ الکبریٰ سے قدیم سلطنتِ روما مراد ہے جو قبل مسیح، دُنیا میں سب سے بڑی سلطنت تھی۔ یارک سے لے کر بغداد تک۔ اور برلن سے لے کر مراکو تک پھیلی ہوئی تھی۔ آلِ سیزر سے اطالیہ کا موجودہ حکمراں طبقہ مراد ہے سیزر جس کو عربی میں قیصر کہتے ہیں شاہانِ رُومہ کا لقب تھا۔

ع "کون بحرِ روم کی موجوں سے ہے لپٹا ہوا"

اس مصرع میں مسولینی کی جارحانہ سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ بحیرۂ رُوم میں اپنا اقتدار قائم کر رہا ہے۔ اور اس کی حالت یہ ہے کہ ہر وقت مصروفِ عمل رہتا ہے۔ کبھی تو فوجوں کی قیادت کرتا ہے اور کبھی اپنی تقریروں سے اپنی قوم کے اندر ولولہ پیدا کرتا ہے۔

تیسرا مشیر

میں تو اس کی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں
جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے حجاب!

لہ مسولینی جو فاشسٹی تحریک کا بانی تھا۔ ایک غریب لوہار کا بیٹا تھا ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوا، اسکول ماسٹری سے ترقی کرتے کرتے اطالیہ کا آمرِ مطلق بن گیا۔ ۱۹۴۵ء میں اس کے سیاسی مخالفوں نے اس کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔

یہ سُن کر تیسرے مشیر نے یہ کہا کہ میں تو مسولینی کی سیاسی دانشمندی اور عاقبت بینی کا معترف نہیں ہوں۔ کیونکہ اُس نے افرنگی سیاست کو بے نقاب کر کے اشتراکیت کو نقصان پہنچانے کے بجائے اُس کی ترقی کا راستہ کھول دیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ افرنگی سیاست بھی مسولینی کی آمریت اور فاشسطیت کی طرح، دیو بے زنجیر، اور بنی آدم کے حق میں بلائے بے درماں ہے یعنی جمہوریت اور آمریت دونوں کا مقصد استعماریت یعنی کمزور اقوام کو اپنا غلام بنانا ہے۔ لیکن جمہوریت اپنا مقصد بڑے معصومانہ انداز میں حاصل کرتی ہے مثلاً قرضہ دیتی ہے، پھر تیل کے چشمے دریافت کرتی ہے۔ پھر موٹریں سپلائی کرتی ہے۔ پھر عیاشی کے لوازم مہیا کرتی ہے پھر مہذب بناتی ہے۔ اُس کے بعد جا کر یں غلامی کا طوق پہناتی ہے۔ مسولینی نے یہ غلطی کی کہ تیر طوطیہ و تمہید حبشہ پر حملہ کر دیا۔ اور جب شام، عراق، حجاز اور مصر کو غلام بنانے والوں نے اُس کے اِس فعل کے خلاف معصومانہ انداز میں صدائے احتجاج بلند کی تو اُس نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف لفظوں میں کہدیا۔ کہ

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کُشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج (ضربِ کلیم)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فرنگی سیاست کو بے نقاب کر دینے کا نتیجہ لازمی طور سے یہ نکلے گا۔ کہ دُنیا اشتراکیت کی طرف مائل ہو جائے گی۔ اس لئے مسولینی اشتراکی تحریک کو فنا نہیں کر سکتا۔

پانچواں مشیر

(ابلیس کو مخاطب کر کے)

اے ترے سوزِ نفس سے کارِ عالم استوار
تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار
آب و گل تیری حرارت سے جہانِ سوز و ساز
ابلہِ جنّت تری تعلیم سے دانائے کار
تجھ سے بڑھ کر فطرتِ آدم کا وہ محرم نہیں
سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار
کام تھا جن کا فقط تقدیس و تسبیح و طواف
تیری غیرت سے ابد تک سرنگون و شرمسار
گرچہ ہیں تیرے مُرید افرنگ کے ساحر تمام
اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار
وہ یہودی فتنہ گر وہ رُوحِ مزدک کا بُروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ
کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار

چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

تیسرے مشیر کی یہ معقول بات سن کر پانچواں مشیر کھڑا ہوا، اور اُس نے ابلیس کو مخاطب کر کے تیسرے مشیر کی تائید میں یہ تقریر کی۔ کہ:۔

اے آقائے نامدار! اس مادی اور سفلہ پرست دُنیا کا سارا کاروبار تیری ہی ابلیسیت اور اُس کے سوز کی بدولت استوار ہے۔ سوزِ نفس سے قوتِ غضب مراد ہے۔ جس کا منبع اور مصدر ابلیس ہے اور دُنیا میں جس قدر قتل و غارت آدم کشی اور ظلم و ستم ہوتا ہے۔ یہ سب اسی قوت کا کرشمہ ہے۔ اور تجھ میں اس قدر قوت ہے کہ تو نے جب چاہا تمام پوشیدہ باتوں کو ظاہر کر دیا۔ یعنی اربابِ سیاست و حکومت پہلے خفیہ کانفرنسیں اور سازشیں اور معاہدے کرتے ہیں پھر جب موقع آتا ہے یعنی جب تو انہیں حکم دیتا ہے۔ تو اُس وقت وہ سازش دُنیا والوں پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ مثلاً ۱۹۰۷ء میں ابلیس کے دو مخلص مریدوں (رُوس اور برطانیہ) نے خفیہ معاہدہ کی رُو سے ایران کو آپس میں تقسیم کیا۔ اِس کے بعد اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ یا ۱۹۱۵ء میں ابلیس کے دو مخلص مریدوں (برطانیہ اور شریف مکّہ) نے خفیہ معاہدہ کیا۔ اس کے بعد عربوں نے اپنے ترکی بھائیوں کے سینے کو برطانوی

سنگینوں سے چھلنی کر دیا۔

اے آقا! یہ دُنیا تو اصل کے لحاظ سے بالکل ٹھنڈی ہے۔ کیونکہ مٹی اور پانی سے مرکب ہے۔ اِس میں جو کچھ سوز و ساز ہے۔ یہ سب تیری ہی عطا کردہ حرارت کا کرشمہ ہے۔ تو نے ہی بنی آدم کو برادر کشی اور غارت گری اور قتل و خون کا سبق سکھایا ہے۔ اور آدمؑ جو در اصل ابلۂ جنّت تھا۔ تیری ہی تلقین کی بدولت واقفِ اسرارِ حیات ہوا۔ اگر تو اس کو "شجرِ ممنوعہ" کا پھل کھانے کی ترغیب نہ دیتا تو وہ قیامت تک "لذّتِ گناہ" کی لذت، اور حوّا کی قدر و قیمت سے آگاہ نہ ہوتا۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے ابلۂ جنّت کی ترکیب اِس حدیث سے اخذ کی ہے ۔ اَھْلُ الْجَنَّةِ بُلْہٌ یعنی جنتی لوگ بڑے بھولے بھالے ہوں گے۔ ۱۲

اے میرے آقا! وہ ہستی بھی، جسے بیوقوف بندے پروردگار سمجھتے ہیں۔ تجھ سے بڑھ کر بنی آدم کی فطرت اور اُن کی افتادِ طبع سے واقف نہیں ہے اور بنی آدم کی تو تیرے سامنے حقیقت ہی کیا ہے۔ فرشتے بھی جو اس قدر محترم اور مکرّم تھے کہ رات دن خدا کی حمد و ثنا اور اُس کے عرش کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ تیری غیرت کے سامنے قیامت تک سرنگوں اور شرمندہ رہیں گے کیونکہ وہ تو ایک ہی جلدش کر خاموش ہو گئے۔ لیکن تو نے جنّت سے خروج گوارا کیا۔ مگر اپنی بات پر اڑا رہا۔ خدا کی ناراضگی مول لے لی۔ لیکن ایک ضعیف خاکی مخلوق کو سجدہ نہ کیا۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ کی تمام قوتیں اور اُن کے سیاسی رہنما، گلیڈسٹن اور بسمارک سے لے کر ٹرومین اور چرچل تک سب تیرے مرید ہیں۔ لیکن اب مجھے اِن کی فراست پر اعتبار نہیں رہا۔

کیونکہ یورپ میں کارل مارکس نے اشتراکیت کا جو فتنہ پیدا کیا ہے۔ اس کی بنا پر ملوکیت، جمہوریت اور آمریت، سب نظام باطل ہو جائیں گے۔ اشتراکیت مزدوروں کے اندر انقلاب کا اس قدر شدید جذبہ پیدا کر رہی ہے کہ وہ عنقریب تمام بادشاہوں، نوابوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی قباؤں کو تار تار کر دیں گے۔ بلکہ اُن کے وجود کو خاک میں ملا دیں گے۔ اِس تحریک کی وجہ سے فاقہ کش طبقوں میں اس درجہ حوصلہ پیدا ہو گیا ہے کہ اب ہر مزدور (زاغِ دشتی) اپنے آپ کو نوابوں اور جاگیرداروں (شاہین و چرغ) کا مدِ مقابل سمجھتا ہے۔ ہم تو اس تحریک کو ابتدا میں بالکل لائقِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن ہماری توقعات کے خلاف، یہ تحریک تو آنکھوں دیکھتے دیکھتے (۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۶ء) آفاق گیر ہو گئی ہے۔ اور آج دُنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جس میں اِس کے سرگرم کارکن یا ہنوا دار یکجہت موجود نہ ہوں چنانچہ اس تحریک کی ہیبت سے بڑے بڑے مدبر اور بادشاہ وزرا اور امرا، لرزہ براندام ہیں۔ بہت سے جاگیرداروں کو رات کو نیند بھی نہیں آتی۔ کہ اگر یہ تحریک یہاں بھی آگئی تو ہم کہاں جائیں گے ؟

اے میرے آقا! میرا اخلاقی فرض ہے کہ میں آپ کو آئندہ خطرات سے مطلع کر دوں۔ پس میں بادب گوش گذار ہوں۔ کہ اگر یہ تحریک کامیاب ہو گئی۔ تو آپ کے قائم کردہ نظام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لہٰذا اس کا ازالہ کرنا آپ کا فرضِ اوّلین ہے۔

حاشیہ:۔ اقبالؔ نے مارکس کو مزدک کا بروز قرار دیا ہے۔ "بروز" فلسفۂ اشراق کی اصطلاح ہے۔ اِس سے مراد ہے کسی شخص میں کسی دوسرے شخص کی (جو وفات پا چکا ہو) بعض یا تمام صفات کا ظہور یعنی اقبالؔ کی رائے میں حکیم مزدک نے جو ایران میں پانچویں صدی میں پیدا ہوا تھا۔ انیسویں صدی میں حکیم مارکس کی رُوح میں اپنا ظہور کیا ہے۔

ابلیس

(اپنے مشیروں سے)

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ بو
کیا زمیں کیا مہر و مہ کیا آسمانِ تو بتو
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو!
کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہُو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے ابتک شرارِ آرزو

خال خال اس قوم میں ابتک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

جب سب اپنے خیالات کا اظہار کر چکے۔ تو ابلیس نے اُن کو مخاطب کر کے یہ کہا۔ کہ

تم لوگ جانتے ہو کہ یہ تمام کائنات، یہ جہانِ رنگ و بو زمین آسمان، چاند سورج، میرے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ میں دُنیا کی ہر شے میں تصرف کر سکتا ہوں۔ میں جب چاہوں اقوامِ یورپ کے اندر بغض، اور حسد کی آگ بھڑکا کر اس دُنیا کو جہنم کا نمونہ بنا سکتا ہوں۔

اربابِ سیاست اور حامیانِ کلیسا، یعنی دُنیا دار اور دیندار دونوں میرے اشاروں پر رقص کرنے کو تیار ہیں۔

جو شخص، خواہ وہ کارل مارکس ہو یا اسٹالن، یہ سمجھتا ہے کہ وہ میرے قائم کردہ نظام کو باطل کر سکتا ہے، میں اُسے چیلنج کرتا ہوں۔ کہ وہ حتی المقدور کوشش کر کے اپنے دل کا ارمان نکال لے۔

بات یہ ہے کہ فطرت نے اس دُنیا میں جو امتیازات، طبقات، اختلافات اور مدارج قائم کر دیئے ہیں۔ اُن کو مٹا دینا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ یعنی جن گریبانوں کو خود فطرت نے اپنے ہاتھ سے چاک کر دیا ہے۔ مزدک ایرانی اور مارکس المانی اِن کو اپنے منطقی استدلال کی سوئی سے رفو نہیں کر سکتے۔ دُنیا میں ہر جگہ

اور ہر شعبہ میں امتیازات اور مدارج جات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً عورت اور مرد کا امتیاز، ذہین اور کند ذہن کا امتیاز، نحیف الجثہ اور قوی الجثہ کا امتیاز، چالاک اور بیوقوف کا امتیاز، سفید اور کالے کا امتیاز، مہذب اور وحشی کا امتیاز۔ حوصلہ مند اور پست ہمت کا امتیاز، بہادر اور بزدل کا امتیاز، اِن امتیازات کا نہ کوئی انکار کر سکتا ہے۔ اور نہ کوئی اُنہیں مٹا سکتا ہے۔ جس دن اختلافات مٹ جائیں گے یہ دُنیا بھی مٹ جائے گی۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق! اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

حاشیہ:۔ میں اس کتاب میں حکیم مزدک، اور اس کی تعلیمات پر کوئی مفصل تبصرہ تو سپردِ قلم کر نہیں سکتا۔ لیکن طلبہ کی آگاہی کے لئے اس قدر کافی ہے۔ کہ یہ شخص پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں، ایران میں پیدا ہوا تھا۔ زردشت اور مانی کی تعلیمات سے متاثر تھا۔ اس کی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عقیدہ یہ تھا۔ کہ خدا (یزداں) تو دُنیا میں مساوات قائم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن شیطان (اہرمن) نے بنی آدم کو حسد، بغض، کینہ، غضب اور نفرت میں مبتلا کر دیا ہے! اسی لئے اختلافات پیدا ہو گئے۔ اور انسانوں کی زندگی تلخ ہو گئی۔ ان ناپاک جذبات کو فنا کرنے کی صورت یہ ہے۔ کہ دُنیا میں زَر و زَن اور زمین سب لوگوں پر یکساں طور پر تقسیم کر دیا جائے جب سب لوگ ساری نعمتوں سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے تو رقابت، نفرت، کینہ اور عداوت کے جذبات خود بخود فرو ہو جائیں گے۔ گویا حکیم دُنیا میں اشتراکیت کا پہلا داعی گذرا ہے۔ ۵۲۸ءمیں نوشیرواں نے اس کو قتل کرا دیا۔ اور اس کے بعد ۵۳۱ء میں اس نے مزدکی فرقہ کا قتل عام کر کے اس تحریک کو ایران سے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

لہٰذا مزدک یا مارکس کی یہ تعلیم کہ زن، زر اور زمین تینوں میں کامل اشتراک اور تمام انسانوں میں کامل مساوات قائم کر دی جائے۔ فطرت، اور عقل انسانی دونوں کے خلاف ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ کوئی قوم آج تک اس پر عمل نہیں کر سکی۔ اور نہ آئندہ کبھی عمل پیرا ہو سکے گی۔

آپ حضرات نے اپنی تقریروں میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اشتراکیت ہمارے نظام کے لئے باعثِ خوف و خطر ہے۔ یا اس میں اتنی قوت ہے۔ کہ وہ ہمارے نظام کو فنا کر دے گی۔ لیکن میں اس امر میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔

میں آپ حضرات کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ کوچہ گرد، آوارہ مزاج، پریشان حال، شوریدہ سر، دماغی امراض میں مبتلا، مخبوط الحواس اشتراکی جن کے پاس نہ کوئی اصول ہے نہ قانون، جو نہ کسی آئین کے پابند ہیں۔ نہ کسی ضابطہ کے خوگر ہیں۔ ہرگز مجھے خوف زدہ نہیں کر سکتے۔ میری صرف ایک ہو، ان کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

ہاں اگر مجھ کو کوئی خطرہ لاحق ہے تو اُس قوم کی طرف سے ہے، جس کے دل میں ابھی تک عشقِ رسول کی آگ سلگ رہی ہے۔ شاید آپ لوگ مجھ سے یہ سوال کریں کہ ایسا باور کرنے کے لئے میرے پاس کیا دلیل ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ۔

ابھی تک اس قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو پچھلے پہر کو اُٹھ کر اللہ کے حضور میں اپنے اشکوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ہر وہ عقلمند آدمی جو حالاتِ حاضرہ سے باخبر ہے اور زمانہ کی رفتار کا مشاہدہ کر رہا ہے مجھ سے متفق ہوگا۔ کہ دُنیا میں اگر کوئی طاقت، میرے نظام کو شکست دے سکتی ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔

جمہوریت، ملوکیت، اشتراکیت، اشتمالیت، نوقومیت۔ لادینیت، مادیت

دہریت، اشتراکیت اور ابیقوریت یہ سب تحریکات میرے ہی قائم کردہ نظام سے پیدا ہوئی ہیں۔ اِن تمام مذاہب کے بانیوں نے میرے ہی سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ یہ سب فتنے میرے ہی جگائے ہوئے ہیں۔ یہ سب بوٹے میرے ہی لگائے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان سے مجھے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔

(۲)

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

(ابلیس اپنی تقریر جاری رکھتا ہے)

شاید آپ حضرات اِس مرحلہ پر یہ اعتراض کریں کہ مسلمان تو قرآن سے بیگانہ نہیں پھر وہ کس طرح ہمارے نظام کو باطل کر سکیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ میں بھی اس حقیقت سے آگاہ ہوں۔ کہ مسلمان قرآن سے بیگانہ نہیں ہیں۔ بلکہ نعوذ ہیں۔ اور اس کی رُوح سے کوسوں دُور ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ بھی میرے دوسرے پرستاروں اور فرمانبرداروں کی طرح سرمایہ داری پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور اُسے جائز سمجھتے ہیں چنانچہ انھوں نے خدا کے بجائے دولت کو مقصدِ حیات بنا لیا ہے۔

میں اِس حقیقت سے بھی باخبر ہوں۔ کہ اس قوم کے علما اور مذہبی پیشوا خواہ وہ اردو میں وعظ کرتے ہوں یا عربی میں اپنی قوم کی رہنمائی کی مطلق اہلیت نہیں رکھتے۔ وہ مشرقی ممالک کی تاریکی کو دُور نہیں کر سکتے کیونکہ وہ رُوحانی قوت (یدِ بیضا) سے یکسر محروم ہیں۔ نیز چونکہ وہ مسائلِ حاضرہ سے بالکل بے خبر ہیں۔ اِس لئے اُن مسائل میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ جن کا موجودہ زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کے حق میں اُن کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں۔

یہ سب کچھ بجا اور برحق ہے لیکن اے میرے رفیقو!

میں اِس حقیقت سے کیسے چشم پوشی کر سکتا ہوں کہ عصرِ حاضر کا خود یہ تقاضا ہے کہ

شریعتِ اسلامیہ نافذ ہو جائے۔ مسلمان بے شک اسلام کی تبلیغ سے غافل ہیں۔ لیکن دُنیا خود اسلام کی طرف آ رہی ہے۔ بنی آدم ہمارے قائم کردہ نظاموں سے غیر مطمئن ہیں اور ایسے نظامِ حیات کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو اُن کے پیچیدہ مسائل کا صحیح حل پیش کر سکے۔ اس لئے مجھے یہ اندیشہ لاحق ہے کہ کہیں وہ اسلامی شریعت کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔

میں نے مانا کہ مسلمان صفحۂ ہستی سے نابود ہو چکے ہیں (عرب اور عجم میں جو لوگ آباد ہیں وہ ہمارے ہی غلاموں کے غلام ہیں) لیکن قرآن تو بجنسہٖ موجود ہے مجھے تسلیم ہے کہ مسلمان شریعتِ اسلامیہ سے باغی ہو گئے ہیں (کسی ملک میں یورپین قانون نافذ ہے کسی میں امریکی) لیکن شریعت تو بدستور کتابوں میں موجود ہے۔

اے دوستو! آئینِ پیغمبر (شریعتِ اسلامیہ) ہمارے حق میں بلا شبہ پیامِ موت ہے (اسی لئے میں نے اپنے گماشتوں کو ارجنٹ اور کانفیڈنشل ہدایات بھیجی ہیں۔ کہ جہاں تک ہو سکے اس کے نفاذ میں رکاوٹیں پیدا کرو) کیوں؟ اس لئے کہ۔

(۱) ہمارے نظام کا پہلا اصول یہ ہے۔ کہ عورتوں میں بے پردگی بے حجابی اور بے حیائی کو رواج دیا جائے۔ کیونکہ معاشرہ کا فساد، عورت کی بے حیائی پر موقوف ہے۔ اور انسانی معاشرہ کو فاسد کر دینا ہی ہمارے ابلیسی نظام کا واحد مقصد ہے۔ ہمارے وجود کی غرض و غایت اس کے سوا اور ہے ہی کیا کہ دُنیا میں بدکاری داخلِ فیشن ہو جائے۔

کیا آپ حضرات نے تاریخِ عالم کا مطالعہ نہیں کیا۔ کہ ہم نے عورتوں میں بے حجابی اور بے حیائی کو عام کر کے صدہا تہذیبوں کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا؟ ہم سب سے پہلے عورت کو تلقین کرتے ہیں کہ گھر کی چار دیواری سے باہر نکل۔ مرد کو کیا حق ہے کہ وہ تجھے "چراغِ خانہ" بنا کر رکھے؟ تجھے تو قدرت نے "شمعِ انجمن" بنایا ہے۔ اس لئے باہر نکل اور اپنے حُسنِ خداداد کی نمائش کر، چونکہ

نمائش کے لئے تقاریب لازمی ہیں اس لئے ہم نے اُسے سمجھایا کہ قوم کی خدمت کے پردہ میں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ کانفرنس منعقد کر، قواعد پریڈ میں حصہ لے، اسمبلی میں تقریر کر، قومی رضا کاروں میں بھرتی ہو، مخلوط جلسوں کی صدارت کر، شاعروں میں لحنِ داؤدی کا مظاہرہ کر، صلیبِ احمر کے لئے چندہ جمع کر۔ اسٹیج پر اپنے رقص کے کمالات دکھا۔ اور بال روم میں اپنے حُسن کا جلوہ دکھا کر دُنیا کو ہوش و خرد سے ہی بالکل بیگانہ بنا دے۔

جب مہذب تعلیم یافتہ اور روشن خیال بلکہ ترقی پسند عورت ہمارے اس زرین مشورہ پر عمل کرتی ہے۔ تو معاشرہ میں تمام وہ مفاسد خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں جو انجام کار اس کو فنا کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں۔ بالفاظِ دگر، اپنے ناموس کی حفاظت نہ کرنے والی عورت، ہمارے نظام کی ترویج و اشاعت اور اُس کے قیام و استحکام کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ اِسی کے تعاون سے ہم اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر نے ایسی عورتوں کو "دامِ ابلیس" کا لقب عطا کیا ہے۔

لیکن آئینِ پیغمبر، سب سے پہلا حملہ ہمارے اسی مورچہ پر کرتا ہے، یعنی شریعتِ اسلامیہ کا پہلا اصول یہ ہے۔ کہ عورت کے ناموس کی حفاظت کی جائے۔ اور اس حفاظت کے لئے اُس نے ایسے زبردست قوانین وضع کئے ہیں کہ اگر عورت اُن پر عامل ہو جائے تو ہم یا ہمارے ایجنٹ ہرگز اس پر قابو نہیں پا سکتے۔ مختصر طور پر یوں سمجھ لو کہ اسلام عورت کی عفت اور عصمت کا سب سے بڑا محافظ ہے۔

(۲) ہمارے نظام کا دوسرا اصول یہ ہے، کہ مردوں کے اندر نسوانی عادات پیدا کر دی جائیں۔ تاکہ وہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے لئے میدانِ جہاد میں نہ جا سکیں یا اگر کسی کے مارے باندھے چلے بھی جائیں تو سرفروشی نہ کر سکیں۔ اِسی طرح اِن کو دوسری مردانہ صفات

مثلاً جفاکشی، آدمیت، ہمدردی، مروّت، ایفائے عہد، تقویٰ، دیانت اور امانت سے یکسر محروم کر دیا جائے اور ان خوبیوں کی بجائے اُن کے اندر عیش کوشی، نفس پرستی، غداری، بے ایمانی، منافقت، ریاکاری، ضمیر فروشی، رشوت ستانی، حرام خوری، خوشامد اور خیانت غرضیکہ تمام بُرائیاں پیدا کر دی جائیں۔

لیکن آئینِ پیغمبر انسانوں کو مردِ بنا تا ہے مردانگی سکھاتا ہے۔ اور روحانہ صفات سے آراستہ کرتا ہے! اور پھر اُن کا امتحان لیتا ہے یعنی مرد آزما ہی نہیں ہے بلکہ مرد آفریں بھی ہے۔

(۳) ہمارے نظام کا تیسرا اُصول یہ ہے کہ انسان کو انسان کا غلام بنایا جائے۔ چنانچہ اسی مقصد کے لئے ہم نے ملوکیت، رہبانیت، پیر پرستی، تجسم حلول، اجبارِیت، سرمایہ داری، جاگیرداری، زمینداری، قبر پرستی، آثار پرستی، شخصیت پرستی اور غیر اسلامی تصوف ——— یہ تمام ادارے قائم کئے ہیں تاکہ مختلف طریقوں سے انسانوں کو انسانوں کا غلام بنایا جا سکے۔

لیکن آئینِ پیغمبری یعنی اسلام غلامی کی ہر صنف ہر قسم اور ہر نوع کے لئے موت کا پیغام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے ملوکیت، رہبانیت، تجسیم، حلول، اجباریت، مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داری، جاگیرداری، زمینداری، اکتنازِ زر، احتکار، ذخیرہ اندوزی، اجارہ داری، اور نظامِ خانقاہی غرضیکہ غلامی کی ہر ممکن صورت کو ناجائز قرار دے دیا ہے چنانچہ دیکھ لو فاروقِ اعظمؓ کے نام سے اگرچہ قیصر و کسریٰ لرزہ براندام تھے۔ لیکن ایک ادنیٰ عورت بھی بھری مجلس میں اُن سے بازپُرس کر سکتی تھی۔

علاوہ بریں اسلام نے ایسا عادلانہ نظام قائم کیا کہ اس میں نہ کوئی شخص بادشاہ یا نواب ہو سکتا ہے اور نہ مفلس یا بے نوا۔ بلکہ ہر شخص فارغ البال اور مرفہ الحال ہوگا۔

(۴) ہمارے نظام کا چوتھا اصول یہ ہے کہ انسانوں کو خدا پرستی کے بجائے زر پرستی

سکھائی جائے۔ تاکہ ایک طرف وہ خدا سے دُور ہو جائیں اور دوسری طرف دنیا میں ہر قسم کی بدکاری اور بدمعاشی کو فروغ ہو سکے۔ گویا ہمارا یہ طریقِ عمل بیک کرشمہ دو کار کا مصداق ہے۔ کیونکہ زر پرستی کا لازمی خاصہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے ہی بھائی کا گلا کاٹنے لگتا ہے۔ اور اسی پر ہمارے نظام کی بقا کا انحصار ہے کہ انسان نوعِ انسان کا شکاری بن جائے۔

لیکن آئینِ پیغمبر یا اسلام، اس کے برعکس یہ تعلیم دیتا ہے کہ اے لوگو! جو دولت تم ناجائز طریقوں سے حاصل کرو گے وہ تمہارے لئے حرام ہے اور جو دولت تم جائز طریقوں سے حاصل کرو وہ بھی اُس وقت تک جائز نہیں ہو سکتی جب تک تم اس پر ½ ۲ فیصدی خدائی ٹیکس یعنی زکوٰۃ ادا نہ کرو۔ اسلام اسی پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ وہ تو اپنے پیروؤں سے صاف لفظوں میں یہ کہتا ہے کہ جائز طریقوں سے دولت حاصل کرنے کے بعد جب تم اس پر زکوٰۃ ادا کر دو، تو باقی ماندہ رقم پر تم متصرف تو ہو سکتے ہو لیکن اسے اپنی ملکیت قرار نہیں دے سکتے کیونکہ تم اور تمہاری دولت دونوں اللہ کی ملکیت ہیں۔ تم بھی اللہ کے ہو اور دولت بھی اُسی کی ہے۔ ہاں اُس نے تمہیں اس کا "امین" بنا دیا ہے۔ تاکہ تم اس کی عطا کردہ دولت کو اُس کی مرضی کے مطابق خرچ کر سکو۔ یاد رکھو حقیقی مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے جو تمہارا رب ہے۔

ہمارے ابلیسی نظام کا پانچواں اصول یہ ہے کہ بادشاہوں کو انسانوں کے علاوہ زمین کا مالک بھی بنایا جائے۔ تاکہ وہ آپس میں ہر وقت برسرِ پیکار رہیں اور اس طرح کشت و خون کا بازار گرم رہے۔ اور جب وہ مفتوحہ زمین کے قطعے اپنے غلاموں کو عطا کریں گے تو جاگیرداری کا نظام قائم ہو جائے گا۔ اور اس طرح وہ لوگ کاشتکاروں کو اپنا غلام بنا سکیں گے۔ یعنی عوام غلامی در غلامی کی لعنت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اور یہی ہمارا مقصود ہے کہ انسان کو غلامی کی زنجیروں میں ایسی سختی کے ساتھ جکڑ دیا جائے۔ کہ وہ خدا پرستی کرنا بھی چاہے تو نہ کر سکے۔

لیکن آئینِ پیغمبر نے اس کے مقابلہ میں ایسا انقلابی پروگرام پیش کیا کہ اگر دنیا اس پر کاربند ہو جائے تو ہمارا نظام بالکل مفلوج ہو کر رہ جائے گا۔ یعنی اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ زمین بادشاہوں کی نہیں ہے بلکہ اللہ کی ہے اور جب اللہ کی ہے تو ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ یعنی جب کوئی بنائے مخاصمت ہی باقی نہ رہی تو لڑائی کس بات پر ہوگی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلامی نظام ہمارے نظام کی ضد ہے۔ یہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ اب آپ غور کریں۔ کہ اسلام کے علاوہ دنیا میں اور کونسا دستور العمل ہے۔ جو ہمارے نظام کی اس کاملیت اور جامعیت کے ساتھ تردید کرتا ہو؟ دنیا میں اسلام کے علاوہ اور کوئی نظام ہمارے نظام کو شکست نہیں دے سکتا۔ اس لئے میں آپ صاحبان سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اہلِ عالم کو اس نظام سے آگاہ نہ ہونے دیں۔ اپنی تمام قوتیں اس بات پر مرکوز کر دیں کہ یہ آئین دنیا والوں کی نگاہ سے پوشیدہ رہے۔ نیز میں آپ کو خوشخبری دیتا ہوں کہ یہ وقت آپ کی جدوجہد کے لئے نہایت موزوں ہے۔ کیونکہ آجکل خود مسلمان اس بات پر یقین نہیں رکھتے کہ، اسلامی آئین ہماری مشکلات کا خاتمہ کر سکتا ہے یا کسی ملک میں رائج ہو سکتا ہے۔ بلکہ اکثر اربابِ عقل تو یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ اس زمانہ میں اسلامی آئین نافذ ہی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا آپ مسلمانوں کی جہالت اور کوتاہ بینی سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور ایسی صورتِ حال پیدا کر دیں۔ کہ یہ بدستور الہیات کے مسائل اور کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھے رہیں۔ اگر وہ ان بیکار باتوں میں مشغول رہے تو یقیناً کبھی اتنی فرصت نہیں ملے گی۔ کہ وہ اسلام کا مطالعہ آئینِ حیات کی حیثیت سے کر سکیں۔

(۳)

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات!
ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات؟
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات!
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اَوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اسکے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات!

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اِسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اِسے

(ابلیس کی تقریر کا آخری حصہ)

حضرات! مسلمان اگر اسلامی آئین کی خوبیوں سے آگاہ ہو جائے اور اس کو نافذ کر دے تو یقین کیجئے کہ اس میں اس قدر طاقت پیدا ہو جائے گی کہ وہ ہمارے نظام کو باطل کر دے گا۔ اس لئے آپ کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ گمراہی کی تاریکی سے نکلنے نہ پائے۔

میں نے بڑی کوششوں سے بنو اُمیہ کے عہد میں یہ نکتہ اس کے ذہن نشین کیا کہ اسلام صرف پوجا پاٹ، رسومِ ظاہری، قوالی اور بعض مسائل نظری کا نام ہے۔ یہ کوئی دستورالعمل یا آئینِ حیات یعنی زندگی کا ضابطہ نہیں ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ یہ میری کوششیں بارآور ہوئیں اور مسلمان، حقائقِ قرآن سے بیگانہ ہو کر، فقہ کے فروعی مسائل میں اس درجہ منہمک ہو گیا۔ کہ اُس نے آمین، رفع یدین، فاتحہ خلف الامام، مسح علی الخفین اور تقبیل الابہامین اور اسی قسم کے دوسرے فروعی مسئلوں پر کئی دفعہ بغداد کے گلی کوچوں کو اپنے بھائیوں کے خون سے رنگین کر دیا۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اِس لئے آپ اُسے اسی قسم کے مسائل میں اُلجھائے رکھیں۔ مثلاً

(۱) حضرت عیسیٰؑ مصلوب ہوئے یا نہیں؟ وفات پا چکے ہیں یا ابھی تک زندہ ہیں؟

(۲) احادیث میں جو نزولِ مسیحؑ کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ تو مسیح سے درحقیقت کیا مراد ہے؟ وہی مسیح ابن مریم نازل ہونگے۔ یا اس اُمت میں کوئی شخص پیدا ہوگا۔ جس میں اُن کی صفات جلوہ گر ہوں گی؟

(۳) خدا کی ذات اور اس کی صفات میں باہمد گر کیا علاقہ ہے؟ آیا ذات باری عین

صفات ہے یا غیر ہے؟ اگر صفات عین ذات ہیں تو اُن کا تحقیق کیسے ہوگا۔ اور غیر ذات ہیں؟ تو توحید کا اثبات کیسے ہوگا؟

(۴) ذاتِ باری موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہے تو وجود کا ذات سے کیا علاقہ ہے؟ وجود عین ذات ہے یا زائد بر ذات ہے یا غیرِ ذات ہے؟

(۵) قرآن اگر خدا کا کلام ہے۔ تو کلام کا متکلم کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ اور تکلم باری کی نوعیت اور ہیئت کیا ہے؟ نیز قرآن کے الفاظ حادث ہیں یا قدیم ہیں؟ اگر حادث ہیں تو ذاتِ باری محلِ حدوث ہو جائے گی، اور جو شے محلِ حدوث ہوتی ہے وہ خود حادث ہوتی ہے۔ اور اگر قدیم ہیں تو تعدد قدما لازم آگیا۔ اور تعدد قدما عند العقل محال ہے۔

(۶) اُمتِ مرحومہ کی نجات، عقیدہ اور عمل دونوں سے ہے یا صرف عقیدہ سے ہے؟ اگر صرف عقیدہ سے ہے تو پھر کون سے عقیدہ سے ہے؟ یعنی مسلکِ اشاعرہ صحیح ہے۔ یا مسلکِ ماتریدیہ یا مسلکِ حنابلہ یا مسلکِ معتزلہ؟

میں آپ حضرات کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ مسلمان کو جہاد سے غافل رکھنے بلکہ بیگانہ بنا دینے کے لئے یہ الٰہیاتی مسائل بالکل کافی اور وافی ہیں۔ انہی مسائل میں اُلجھ کر مسلمان جہاد سے بیگانہ ہو گیا۔ اور آئندہ بھی اس کی بیگانگی یقینی ہے۔

اس لئے میرا مشورہ یہی ہے۔ کہ تم جس طرح بھی ہو سکے اسے عمل صالح اور جہاد سے بیگانہ بنا دو۔ اگر تم نے اس معاملہ میں کامیابی حاصل کر لی تو ہر میدان میں تمہاری ہی فتح ہوگی۔ مسلمان کسی محاذ پر کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

اگر تم ابلیسی نظام کی بقا چاہتے ہو اور یقیناً چاہتے ہو تو پھر ایسی کوشش کرو کہ مسلمان امریکہ اور برطانیہ کی غلامی سے نکلنے نہ پائے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی تمہارے لئے بہت

مفید ثابت ہوگی کہ تم مسلمان کو شاعری اور غیر اسلامی تصوف میں منہمک رکھو۔ نیز اُس کو "ترقی پسند ادب" کا شیدائی بنا دو۔ تاکہ وہ ہر وقت جنسی مسائل پر غور کرتا رہے۔ اور ہر وقت عورت اُس کے اعصاب پر سوار رہے۔ اور وہ کسی وقت اُس سے اُکتا جائے تو اُسے روٹی اور پیٹ کے مسائل میں اُلجھا دو، تاکہ وہ مادیات سے بالاتر ہو کر اعلیٰ اخلاقی اقدار کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ اور جو لوگ ادبِ لطیف سے بہرہ اندوز ہونے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں اُنہیں تصوف اور قوالی کا گرویدہ بنا دو۔ تاکہ خانقاہوں اور حجروں سے باہر نکل کر، رسمِ شبیری، ادا کرنے کے قابل ہی نہ رہیں۔ یعنی عمل کی صلاحیت بالکل ختم کر دو۔

آخر میں اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ہر وقت مسلمانوں کی بیداری کے تصور سے لرزہ براندام رہتا ہوں۔ بیداری سے میری مراد یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے دین (اسلام) کی حقیقت سے آگاہ ہو گئے تو پھر ہم کو روئے زمین پر کسی جگہ پناہ نہیں مل سکے گی۔ کیونکہ اسلام محض نماز روزہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایسا نظامِ زندگی ہے۔ کہ اگر مسلمان اس پر عامل ہو جائیں تو اُن کے اندر اس قدر طاقت پیدا ہو جائے گی کہ وہ ساری کائنات کو اسلامی قانون کا پابند بنا دیں گے اور اگر کوئی فرد اُن کی یعنی اُن کے نافذ کردہ قانون (اسلام) کی اطاعت سے انحراف کریگا تو وہ اُس سے بازپرس کر سکیں گے یعنی ساری کائنات کے محتسب بن جائیں گے۔

لہٰذا میرا آخری مخلصانہ مشورہ آپ حضرات کو یہ ہے کہ آپ جس طرح ہو سکے مسلمان کو "مزاجِ خانقاہی" میں پختہ تر کر دیں۔ اب میں اس بات کی وضاحت کر دوں۔ کہ اس سے میری مراد کیا ہے۔ واضح ہو کہ میری وضع کردہ یہ اصطلاح اُن تمام عقائد و افکار و اعمال پر حاوی ہے۔ جو مسلمانوں کو جہاد سے بیگانہ کر سکتے ہیں۔ اسلام انسان کے اندر جہاد

فی سبیل اللہ کی رُوح پیدا کرتا ہے اور یہی اس نظام کی اصلی غرض و غایت ہے تمام عقائد و افکار و اعمال سے مقصود صرف یہ ہے۔ کہ مسلمان اپنی جان اور اپنا مال دونوں خدا کی راہ میں قربان کر سکے۔ اور شیروں کی طرح "باطل" کے خلاف صف آرا ہو جائے شیر کی مثال میں نے اس لئے دی ہے۔ کہ شیر ہمیشہ نتائج سے بے پروا ہو کر حملہ آور ہوتا ہے۔ اور دوسرا وصف اس میں یہ ہے کہ وہ اپنا جوہرِ شیری ہمیشہ زخمی ہو کر دکھاتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام، انسان کے اندر مزاجِ اسد اللّٰہی پیدا کر دیتا ہے۔ یعنی مسلمان اللہ کا شیر بن جاتا ہے۔ چونکہ یہ مزاج ہمارے حق میں پیامِ موت ہے اس لئے میں نے اپنی بقا کی یہ صورت تجویز کی ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی صورت عقلاً ممکن بھی نہیں ہے کہ اس کے اندر مزاجِ خانقاہی پیدا کر دیا جائے جو مزاجِ اسد اللّٰہی کی ضد ہے۔ یعنی ایسی کوشش کرو کہ مسلمان:-

(۱) موجودہ غلامانہ زندگی اور گدایانہ ذہنیت سے بالکل مطمئن ہو جائے۔ (۲) اپنی تمام تر توجہ نجاتِ آخروی پر مبذول کر دے۔ (۳) اس کے حصول کے لئے دن رات حجروں اور خانقاہوں میں چلہ کشی کرتا رہے۔ (۴) رات بھر قوالی سنتا رہے۔ (۵) دن بھر سوتا رہے۔ (۶) اور اپنی ضروریات زندگی کے لئے امریکہ کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا رہے۔ اور اس سے قرضِ حسنہ وصول کر کے غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کرتا رہے۔

تبصرہ

جیسا کہ میں نے تمہید میں لکھا ہے۔ کہ یہ نظم اقبال کی شاعری، دینی عقائد اور فلسفہ کے امتزاج کا منتہیٰ ہے جس میں انہوں نے اپنے تمام بنیادی افکار کو نہایت دلکش پیرایہ اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ساری نظم میں مصرعہ تو در کنار ایک لفظ بھی بیکار نہیں ہے۔ اور پھر ہر لفظ اپنی جگہ ایسا موزوں اور برمحل ہے کہ اس کی جگہ دوسرا لفظ نہیں رکھ سکتے۔ میرا یہ خیال ہے کہ انھوں نے اس نظم کے لکھنے میں کافی غور و فکر کیا ہوگا۔ فکر سخن تو اس قدر نہیں ہوگی جس قدر فکر الفاظ اور جستجوئے خیالات ہوگی۔ بحیثیت مجموعی میں اس نظم کو علامہ مرحوم کے ۳۰ سالہ پیغام کا لُبِّ لُباب سمجھتا ہوں۔ انہوں نے اسلام کے تمام بنیادی اُصولوں کو ایسی جامعیت اور وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے کہ اس نظم کو اس موضوع پر اقبال کا حرفِ آخر کہہ سکتے ہیں۔ خوبی اس اسلوب کی یہ ہے کہ اس نظم کے پڑھنے سے اتنا ہی نہیں معلوم ہوتا۔ کہ اسلام کیا ہے۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کیا نہیں ہے۔ گویا اس نظم کو سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص دینی معاملات میں دھوکہ نہیں کھا سکتا۔ ذیل میں اس کے حقائق و معارف بالترتیب بیان کرتا ہوں۔ تاکہ ناظرین اندازہ کر سکیں کہ میں اس نظم کی توصیف میں اس قدر رطب اللسان کیوں ہوں۔ اور اُس کو اقبال کا شاہکار کیوں قرار دیتا ہوں۔

(۱) دُنیا کو عناصر کا محض ناکمیل یا سالماتِ مادی کے بے مقصد امتزاج کا نتیجہ سمجھنا سراسر ابلیسیت ہے۔ اس لئے مارکسزم، کمیونزم، سوشلزم، نام نہاد ترقی پسند ادب، مادہ پرستی اور دہریت یہ سب ابلیسی نظام کے مختلف شعبے ہیں۔ مسلمان چونکہ یہ یقین کرتا ہے کہ دُنیا

کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ اِس لئے وہ ان میں سے کسی تحریک سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھ سکتا۔

(۲) ابلیس جانتا ہے کہ خدا ابلیسی نظام کو برباد کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ اس کی بقا کی تدبیر پر غور کر رہا ہے۔ اقبال نے ابلیس کے کیریکٹر کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے! وہ خالق یا خدا کے بجائے "کارساز" کا لفظ استعمال کرتا ہے اور دوسرا مصرع تو خالص ابلیسی انداز کا علمبردار ہے۔ یعنی ابلیس اس دُنیا کو "جہانِ کاف و نون" نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا سمجھے تو پھر "خدا پرست" ہو جائے گا۔

(۳) ملوکیت مع جاگیرداری، دہریت (مادیت) لامذہبیت، جبریت، سرمایہ داری اور ذخیرہ اندوزی، یہ سب حضرتِ ابلیس کی ایجادات ہیں۔ یہ سب اس کے نظام کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اِس لئے ایک مسلمان، ان میں سے ایک بات کا حامی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اِن کی تردید اس کا دینی اور اخلاقی فرض ہے۔ اِسی لئے سرکارِ دوعالم صلعم نے فرمایا کہ جو مسلمان خلافِ شرع بات دیکھے اور چپ رہے تو سمجھ لو کہ اس کا ایمان بہت کمزور ہے۔

(۴) "کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد"، اس مصرع سے خالص ابلیسیت ٹپکتی ہے۔ کیونکہ یہ قول سراسر تکبر پر دلالت کر رہا ہے۔

اقبال کا کمالِ فن (شاعرانہ آرٹ) یہ ہے کہ انہوں نے ابلیس کی سیرت نہایت عمدگی سے پیش کی ہے۔ اگر وہ خدا پرست ہوتا۔ تو اس قدر لاف زنی ہرگز نہ کرتا۔

(۵) ابلیسی نظام کی غایت یہ ہے کہ غلام، خوئے غلامی میں پختہ تر ہو جائیں تاکہ خدا پرستی کرنا بھی چاہیں تو نہ کر سکیں۔ بلکہ اس نظام کا مقصد یہ ہے کہ لوگ خدا کو بھول جائیں۔

(۶) ابلیسی نظام میں اگر کسی مسلمان کے دل میں آزادی کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ تو اُس کے

گماشتے فوراً اس آرزو کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ یہ فن انگریزوں نے ۱۸ویں صدی کے آغاز میں اُن "ٹھگوں" سے سیکھا تھا۔ جنہوں نے اس کی مدد سے قدیم ہندوستان کے لاکھوں اصلی باشندوں کا خاتمہ کر دیا۔ اور جو باقی بچے اُنہیں "داس" اور "داسی" بنا دیا۔ یہی داسیاں، دکن میں جا کر "دیوداسیاں" بن گئیں۔

(۷) ابلیس نے اپنی ذاتی قابلیت سے کام لے کر صوفی اور مُلّا کو ملوکیت کا بندہ بنا دیا ہے۔ جن صوفیوں اور مُلّاؤں نے ۱۸۵۷ء میں بندگی سے انکار کیا تھا۔ اُن کو ابلیس نے یا تو پھانسی دلوا دی یا انڈمان بھجوا دیا۔

(۸) نتائج کے لحاظ سے قوالی (غیر اسلامی تصوف) اور علم کلام (فلسفہ) میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں انسان کی قوتِ عمل کو فنا کر دیتے ہیں۔

(۹) اگر دلوں میں جہاد کا جذبہ اور سرفروشی کا ولولہ کارفرما نہ ہو تو طواف و حج کی حیثیت یا قیمت "ہنگامہ" سے زیادہ نہیں ہے۔

عیدِ آزاداں، شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں، ہجومِ مومنین

(۱۰) جو شخص یہ کہے کہ اس زمانہ میں جہاد بالسیف حرام ہے وہ ابلیس کا شاگرد ہے۔

(۱۱) موجودہ مغربی جمہوریت دراصل ملوکیت ہی کی ایک دلفریب شکل ہے۔ اور ابلیس کی ایجاد ہے۔

(۱۲) ہر وہ فرد یا جماعت جو غیر کی کھیتی پر نظر رکھے، ملوکیت کی راہ پر گامزن ہے۔ اور اسلامی نظام کی دشمن ہے۔

(۱۳) مغرب کا جمہوری نظام دراصل چنگیزیت سے بھی بدتر ہے اور بنی آدم کے حق میں لعنت ہے۔

(۱۴) ابلیس کو نہ ملوکیت سے کوئی خطرہ ہے نہ جمہوریت سے نہ سرمایہ داری سے نہ آمریت سے، نہ نازیت سے نہ فاشطیت سے نہ اشتراکیت سے نہ مزدکیت سے نہ اشتمالیت سے کیونکہ یہ سب تحریکیں اُسی کی پروردہ اور آوردہ ہیں۔ اُسے اگر کوئی خطرہ ہے تو اسلام سے ہے۔

(۱۵) اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظام، ابلیسی نظام کی ضد ہے۔ کلمہ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ درحقیقت ساری دُنیا کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

(۱۶) اس لئے ابلیس کی کوشش یہ ہے کہ دُنیا، شرعِ پیغمبر کی خوبیوں سے واقف نہ ہونے پائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ابلیس نے اپنے مشیرانِ سلطنت کو یہ مشورہ دیا ہے کہ مسلمانوں کو الٰہیات (۱) یعنی علم کلام کے مسائل میں اُلجھائے رکھو، اور اُن کے اندر (۲) شاعری اور قوالی کا ذوق پیدا کر دو مختصر یہ کہ:۔

ع مُختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اِنہیں

اقبال نے اسلامی اصولوں کی تبلیغ کر کے اپنا فرض پورا کر دیا۔
اب مسلمان خود فیصلہ کر لیں کہ انہیں اپنے اندر کونسا مزاج پیدا کرنا چاہیئے۔
خانقاہی یا اسد اللّٰہی؟

بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلّی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشہ کو بنا سکتے ہیں خارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا
محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غوّاص
کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا
دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا
دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیرِ اُمم کیسا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا
اخلاصِ عمل مانگ نیاگانِ کہن سے
"شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا!"

تمہید:- بڈھے بلوچ سے بلوچستان کا خانہ بدوش بوڑھا بھی مراد ہو سکتا ہے۔ اور شائی مسلمان بھی، کیونکہ

(ا) خانہ بدوش صحرا نورد بلوچ کی طرح سچا مسلمان بھی اپنے آپ کو کسی خطۂ زمین سے مستقل طور پر وابستہ نہیں کر سکتا۔ یعنی کسی ملک کو وطن نہیں بنا سکتا کیونکہ ساری دُنیا اس کا وطن ہے۔

(ب) بلوچ کی طرح سچا مسلمان بھی خانہ بدوش ہوتا ہے۔ کیونکہ اس دُنیاوی زندگی کو عارضی یقین کرتا ہے۔ وہ کہیں گھر نہیں بناتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ:-

جگہ دل لگانے کی دُنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

سرکارِ دو عالم صلعم کی یہ حدیث ہر وقت اُس کے پیشِ نظر رہتی ہے کہ دُنیا میں میری مثال اُس مسافر کی سی ہے۔ جو کسی پُل پر تھوڑی دیر کے لئے دم لینے کی غرض سے بیٹھ گیا ہو۔

(ج) بلوچ کی طرح سچا مسلمان بھی شہروں کی معصیت آمیز زندگی سے دُور رہتا ہے۔

نہ وہ ریڈیو سنتا ہے نہ سنیما دیکھتا ہے۔ نہ بال میں نیم برہنہ عورتوں کے ساتھ رقص کرتا ہے۔ نہ ریس میں جاتا ہے نہ کلب میں برج کھیلتا ہے اور نہ ہوٹلوں میں دادِ عیش دیتا ہے۔ اس لئے میں بلوچ سے "مردِ مومن" مراد لیتا ہوں۔ اور یہ مومن قوم کے نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہے۔ کہ:-

(۱) اے نوجوانو! بیاباں کی ہوا اور صحرا کی فضا، شہروں کی ناپاک اور مسموم آب و ہوا سے بدرجہا بہتر ہے۔ شہروں کا حُسن پروردۂ غازہ یعنی نقلی ہوتا ہے۔ لیکن صحرا کا حُسن پروردۂ فطرت یعنی اصلی ہوتا ہے۔ نیز بیابانی زندگی سے صحت بھی ترقی کرتی ہے۔ اور سیرت بھی استوار ہوتی ہے۔ اور جفاکشی کی عادت بھی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن دلّی۔ لکھنو۔ لاہور۔ کراچی جیسے شہروں میں تو اکثر نوجوانوں کی زندگیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ دلّی اور بخارا سے، ترقی پسند شہر مراد ہیں۔ خواہ وہ پاکستان میں ہوں یا ہندوستان میں یا ترکستان میں۔ دلّی اور بخارا سے مراد ہیں۔ وہ شہر جن میں تہذیبِ مغرب کی لعنت سہ گانہ یعنی، مئے و قمار و ــــ زنانِ بازاری، کی افراط ہو۔

(۲) اے نوجوان! تو اپنے اندر سیلاب کی صفت پیدا کر۔ جب تیرے اندر یہ شان پیدا ہو جائے گی۔ تو تجھے معلوم ہو گا۔ کہ کشمیر کی وادی بھی میری ہی ہے اور ترکستان اور تاجکستان کا صحرا بھی میرا ہی ہے۔

مشاعروں میں شرکت مت کر۔ کیونکہ دُنیا میں کسی قوم نے شاعری کے ذریعہ سے دشمن پر فتح حاصل نہیں کی۔ بلکہ اپنے اندر دُنیا کو فتح کرنے یعنی سیلِ رواں کی صفت پیدا کر۔

(۳) یاد رکھ! دُنیا میں فتحمندی اور کامیابی اُسی قوم کو حاصل ہو سکتی ہے جس کے جوانوں

میں غیرت کا مادہ پایا جاتا ہے۔ بے غیرت قوم کبھی غلامی کی زنجیروں کو نہیں توڑ سکتی۔ اور غیرت مند قوم کبھی غلام نہیں رہ سکتی۔ اور غیرت دار نوجوان اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہ سکتا۔

کیا بابر کی مثال تیرے سامنے موجود نہیں ہے۔ کہ اگرچہ اُسے کئی دفعہ شکست ہوئی لیکن وہ ہمت نہیں ہارا۔ بلکہ اُس نے ہر شکست کو اپنے حق میں مہمیز قرار دیا اور آخر کار ہندوستان فتح کر لیا۔

نوٹ:- اقبالؔ کے نظامِ افکار میں "غیرت" کو جس قدر اہمیت حاصل ہے اُس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے۔ کہ اُن کی رائے میں

دوسرا نام اِسی دین کا ہے فقرِ غیور

یعنی غیرت کا جذبہ، دینِ اسلام کا جزو لاینفک ہے۔

اِس شعر میں غیرت سے مراد ہے نصب العین کے حصول کی خاطر مٹنے کا جذبہ، یہ غیرت اتنی بڑی چیز ہے۔ کہ:-

ع پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

نوٹ:- نصب العین سے میری مراد ہے تبلیغ و اشاعتِ اسلام اِس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے۔ کہ اگر مسلمان میں یہ جذبہ نہ ہو تو اقبالؔ کی رائے میں وہ مسلمان زندہ نہیں بلکہ مردہ ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:-

تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن
اے مسلماں! مُردن است این زیستن

(۴) اے نوجوان! یہ تمام خوبیاں صرف اس شخص میں پیدا ہو سکتی ہیں جو شیشہ کو سنگِ خارا یعنی اپنی خودی کو جو شروع میں کانچ کی طرح کمزور ہوتی ہے پتھر کی طرح سخت بنا لے۔

لیکن یہ ہُنر کلفٹن، باغِ جناح، اور پی ایر تھیٹر، آرٹ کاؤنسل یا رائل بوٹ کلب میں نہیں سکھایا جاتا۔ اگر تو خودی کو مستحکم کرنا چاہتا ہے تو کسی کامل (مردِ مومن) کی صحبت اختیار کر۔

نوٹ:۔ اس شعر کا سارا لطف یا مفہوم لفظ "پوشیدہ" میں پوشیدہ ہے۔ یعنی خودی کو مستحکم کرنے کا ہُنر نہ کتابوں میں مرقوم ہے۔ اور نہ اس موضوع پر خطبات دیئے جاتے ہیں نہ "لٹریچر" شائع کیا جاتا ہے۔ اور نہ قرآن کی ترجمانی کے پردہ میں اپنے لئے زمین تیار کی جاتی ہے، بلکہ اس کا تعلق ہدایت اور ارشاد سے ہے یعنی مردِ کامل (مرشد) طالبِ استحکامِ خودی کو خلوت میں کچھ ہدایات دیتا ہے۔ اور وہ اُن پر عمل کر کے اپنی خودی کو مستحکم کر لیتا ہے۔ اقبالؔ نے اسی پوشیدہ ہُنر کو ایک جگہ "افسوں" سے تعبیر کیا ہے:۔

من نمی دانم چہ افسوں می کند
رُوح را در تن دگرگوں می کند

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شیشہ کو خارا بنانے کا ہُنر "سالانہ اجتماع" میں نہیں سکھایا جاتا۔

(۵) اے نوجوان! اس حقیقت کو ذہن نشین کر لے کہ قوم کی تقدیر یعنی مستقبل یعنی اس کی ترقی، تیری جد و جہد پر موقوف ہے۔ جیسے افراد ہوں گے ویسی ہی قوم بھی ہو گی۔ اس لئے تجھے اپنی زندگی قوم کی ترقی کے لئے وقف کر دینی چاہیئے۔ اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ اگر میں غفلت سے کام لوں گا تو میری قوم تباہ ہو جائے گی۔

(۶) جو غواص (غوطہ خور) ساحل پر بیٹھا رہتا ہے۔ وہ کبھی قعرِ دریا سے موتی نکال کر نہیں لا سکتا۔ اسی طرح جو مسلمان نوجوان اپنی زندگی ہوٹل اور کلب میں بسر کرتا ہے۔ اور

استحکامِ خودی کے لئے کوشش نہیں کرتا۔ وہ نہ خود کبھی ترقی کر سکتا ہے اور نہ اُس کے وجود سے قوم کو کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ اسکو سے کچھ وظیفہ مقرر ہو جائے۔

(۷) اے نوجوان! اس صداقت کو اپنے دل میں جگہ دے، کہ اگر تو دین کو قربان کر کے آزادی حاصل کرے گا تو اس سودے میں تجھے سراسر نقصان ہو گا۔ بیشک آزادی حاصل کرنے کے لئے کوشش کر۔ لیکن دین بیچ کر آزادی مت لے۔

نوٹ:۔ اس شعر میں مرحوم نے مسلمان نوجوانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا تھا کہ نظریہ وطنیت قبول کر کے اگر تمہیں آزادی حاصل ہوئی تو وہ بیکار ہے۔ کیونکہ جب تم مسلمان ہی نہ رہے تو آزاد ہو کر تمہیں کیا فائدہ ہوا؟ ....

....

....

(۸) اے نوجوان! اس وقت دُنیا میں اسلام (روح) اور وطنیت (بدن) کے مابین زبردست جنگ برپا ہے۔ تہذیبِ مغرب، جس کی بنیاد مادہ پرستی ہے اسلام کو مٹانے پر تُلی ہوئی ہے۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے اقوامِ یورپ کو "درندوں" سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس تہذیب کا لازمی نتیجہ یہ ہے۔ کہ انسان اپنی عادات کے اعتبار سے حیوان بن جاتا ہے چنانچہ دوسری جنگِ عظیم نے اس حقیقت کو واضح کر دیا۔

(۹) اے نوجوان! اس وقت یزداں اور اہرمن (اسلام اور کفر) میں شدید مقابلہ ہو رہا ہے۔ ابلیس یعنی یورپ کو اپنے مادی وسائل پر ناز ہے۔ اور اللہ یعنی اسلام کو مومنوں پر بھروسہ ہے۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ ایمان کی قوت، ہمیشہ مادی وسائل پر

غالب آجاتی ہے۔ چنانچہ اسی قوت کی بدولت ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے چھ سات میل تک خشکی میں اپنے جہاز کھینچ کر قسطنطنیہ کی بندرگاہ میں لا کر ڈال دیئے تھے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو تاریخ دولتِ عثمانیہ مطبوعہ اعظم گڑھ جلد اول صـ۱۱۲)

(۱۰) یہ سچ ہے کہ کوئی شخص قبل از وقت، نہیں بتا سکتا کہ فتح کس کی ہو گی لیکن اگر تو اپنی مومنانہ فراست سے کام لے تو تجھے معلوم ہو سکتا ہے کہ آخر میں ہمیشہ حق ہی کا بول بالا ہوتا ہے۔

(۱۱) پس اے نوجوان! تو اس نازک وقت میں اپنے بزرگوں کے طرزِ عمل کو سامنے رکھ اور اُن کے نقشِ قدم پر چل دو مجھے یقین ہے کہ تو ضرور کامیاب ہو گا: "شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را" یہ حافظ شیرازی کی غزل کا مشہور مصرعہ ہے۔ شاہاں سے یہاں بزرگانِ دین کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اگر مسلمان، سلفِ صالحین کا اتباع کریں گے تو فضلِ ایزدی ضرور ان کے شاملِ حال ہو گا۔

تصویر و مصوّر

تصویر

کہا تصویر نے تصویر گر سے
نمائش ہے مری تیرے ہُنر سے
ولیکن کس قدر نا منصفی ہے
کہ تو پوشیدہ ہو میری نظر سے!

مصوّر

گراں ہے چشمِ بینا دیدہ ور پر
جہاں بینی سے کیا گذری شرر پر!
نظر درد و غم و سوز و تب و تاب
تو اے ناداں قناعت کر خبر پر

تصویر

خبر، عقل و خرد کی ناتوانی
نظر، دل کی حیاتِ جاودانی
نہیں ہے اس زمانے کی تگ و تاز
سزاوارِ حدیثِ لَن ترانی

مصوّر

تو ہے میرے کمالاتِ ہُنر سے
نہ ہو نومید اپنے نقش گر سے
مرے دیدار کی ہے اک یہی شرط
کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے!

تمہید:۔ یہ ایک بہت دلچسپ مگر حقائق و معارف سے لبریز تمثیلی نظم ہے جس میں اقبالؔ نے از اول تا آخر رمز و کنایہ میں گفتگو کی ہے۔ تصویر سے وسیع معنی میں کائنات اور اخص معنی میں انسان مراد ہے اور مصوّر سے خدا مراد ہے۔ اگر استعارات اور کنایات کے پردے ہٹا دیئے جائیں۔ تو اس نظم کا مطلب یہ ہے کہ:۔

(۱) انسان نے خدا سے کہا کہ اس میں تو شک نہیں کہ میری ہستی (نمائش) تیرے فعل تخلیق (ہنر) پر موقوف ہے۔ یعنی میرا وجود ذاتی، اصلی، حقیقی یا مستقل نہیں ہے۔ بلکہ تیری صفتِ خالقیت کا کرشمہ ہے، لیکن اے خدا! یہ بات میرے لئے بہت تکلیف دِہ (نامنصفی) ہے۔ کہ تو میری نظر سے پوشیدہ ہے۔

آخری مصرع میں دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کے دیکھنے یا اُس سے ملاقات کرنے کی آرزو پوشیدہ ہے اس حقیقت کو شرقی اور مغربی دونوں شعراء نے اپنے کلام میں واضح کیا ہے مثلاً انگریزی ادبیات میں ورڈسورتھ، کالرج اور براؤننگ کی شاعری میں یہ رنگ بہت نمایاں ہے۔

(۲) یہ سنکر خدا نے انسان سے یہ کہا کہ اے نادان! تو اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہے۔ کہ چشمِ بینا (حقیقت رس کی آرزو) دیدہ ور، طالبِ دیدار کے لئے پیامِ موت بن جاتی ہے۔ دیکھ لے! جب تک شرر میں جہاں بینی کی آرزو نہیں پیدا ہوئی وہ مادرِ آتش کی آغوش میں ہر مصیبت سے محفوظ تھا۔ لیکن جب اُس میں یہ آرزو پیدا ہوئی۔ تو اپنی اصل (شعلہ) سے جدا ہوا (کیونکہ جدائی کے بغیر جہاں بینی ناممکن تھی) اور جب جدا ہوگیا۔ تو اُس نے دُنیا کو بیشک دیکھ لیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ میں فنا ہوگیا۔ لہٰذا ثابت ہوگیا کہ دیکھنے کی آرزو کا نتیجہ فنا ہے یعنی دیکھنے کی آرزو سے نظر پیدا ہوتی ہے۔ اور نظر کا نتیجہ درد و غم و سوز و تب و تاب ہوتا ہے۔ اور سوز کا نتیجہ فنا کے سوا اور کیا ہے؟ اس لئے میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو نظر کے بجائے خبر پر قناعت کر۔

اس کا عاشقانہ مفہوم یہ ہے کہ معشوق عاشق سے کہتا ہے کہ دیکھنے کے لئے اول تو حوصلہ کی ضرورت ہے۔ اور یہ چیز بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے عاشق سارے سنسار کو

تجھے تو معشوق پردے میں بسے۔ اور اگر دید کی طاقت پیدا ہو بھی گئی، تو دیدار کے بعد تو آپے میں کب رہے گا؟ دیکھ لے! منصور حلاج نے ہمیں دیکھا تو کیا نتیجہ ہوا! اس لئے مناسب یہی ہے کہ تو ہمارے مخبرِ صادق صلعم کے ارشاد پر قناعت کر کہ "اے لوگو! اللہ پر ایمان لاؤ، جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔"

دوسرے شعر میں نظر اور خبر دونوں لفظ نہایت غور طلب ہیں شریعت کا دارو مدار خبر پر ہے اور خبر سے مراد رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ اس لئے میری اتباع کرو۔ سارا دین اسی فقرہ میں بند ہے۔ چونکہ ہم مخبرِ صادق کی رسالت پر ایمان لاتے ہیں۔ اس لئے اُن کی خبر پر یقین کرتے ہیں۔ نبی کہتے ہیں اُس شخص کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو خبریں دیتا ہے۔ اور اُس کا پہلا قول یہی ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ۔ طریقت کا انحصار نظر پر ہے۔ یعنی دینی مسلمان جو خبر پر ایمان لایا ہے۔ اب بطور خود مشاہدہ اور معائنہ کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ اطمینانِ قلب حاصل ہو جائے۔ لیکن یہ کام صرف عاشق کر سکتا ہے۔ یعنی وہ شخص جس کے دل میں دیکھنے کی آرزو پیدا ہو جائے اُس کے لئے مرشد کی صحبت لازمی ہے۔ وہ دیکھنے کا طریقہ سکھا دیتا ہے۔

(۳) یہ سُن کر انسان نے خدا سے کہا کہ اے میرے خالق! تو نے درست فرمایا لیکن میں باادب یہ عرض کرتا ہوں۔ کہ میں خبر کی منزل پر قناعت کرکے ابتدائی یا ادنیٰ درجہ کی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ مجھے بخوبی علم ہے کہ خبر پر وہ لوگ قناعت کرتے ہیں جو کم عقل ہوتے ہیں۔ خبر تو عقل و خرد کی ناتوانی کا ثبوت ہے ہمیشگی کی زندگی تو دیدار سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ زمانہ کا اقتضا یہ ہے۔ کہ انسان مشاہدہ کرنا چاہتا ہے۔ محض اس خبر پر اکتفا کرنا پسند نہیں کرتا۔ آج سائنٹفک تحقیقات نے انکشاف و اختراعات

(تگ و تاز) کا دروازہ کھول دیا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ لہٰذا اس زمانہ کی اسپرٹ، اس امر کی سزاوار نہیں ہے کہ تو طالبانِ دیدار کو، لن ترانی، کی حدیث سُنا کر دیدار سے محروم کر دے۔

(۴) جب خدا نے انسان کی یہ دلیل سُنی۔ تو اُسے یقین ہوگیا کہ یہ شخص واقعی اپنی طلب میں مخلص ہے۔ اور واقعی مجھے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے خدا نے کہا کہ اے انسان! اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ تو خود بخود موجود نہیں ہوا۔ بلکہ میرے پیدا کرنے سے (کمالاتِ ہنر) عالمِ وجود میں آیا۔ اس لئے تجھے عقل سے کام لے کر یہ قضیہ مرتب کرنا چاہیئے کہ۔

(ا) میں خود پیدا نہیں ہوا ہوں۔ بلکہ معلول ہوں۔
(ب) ہر معلول کے لئے علت لازمی ہے۔
(ج) اس لئے ضرور میرا خالق موجود ہے۔

اس عقلی دلیل سے تو میری ہستی پر ایمان لا سکتا ہے۔ لیکن اگر تجھے میرے دیکھنے کی آرزو ہے تو اس کی صورت یہ ہے۔ کہ تو اپنی خودی کا مشاہدہ کر، میں تجھ سے جدا تو نہیں ہوں۔ بلکہ تیرے ہی اندر پوشیدہ ہوں۔ جب تو کسی کامل سے دیکھنے کا پوشیدہ ہنر حاصل کر لے گا۔ تو تجھے معلوم ہوگا۔ کہ تو وہ تو نہیں ہے، بلکہ میں ہوں اور جسے تو "میں" کہتا ہے۔ وہ میں نہیں بلکہ "وہ" ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر کسی انسان کو خدا کے دیکھنے کی آرزو ہو (جو اس زمانہ میں بالکل مفقود ہو چکی ہے) تو اُسے اپنے آپ کو دیکھ لینا کافی ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ جس نے اپنے نفس کی معرفت حاصل کر لی تو اُس نے اپنے رب کی معرفت حاصل کر لی۔ کیونکہ انسان اور خدا (طالب اور مطلوب، ناظر اور منظور) عاشق اور معشوق

دو نہیں ہیں۔ بس وہی ایک ذاتِ واحد ہے۔ جو کہیں خار کی شکل میں نمایاں ہے اور کہیں گُل کی شکل میں ہویدا ہے۔ کیا خوب فرمایا ہے مرشدی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے۔

دو عالم میں نہیں موجود و مشہود
بجز ذات و صفات، افعال و آثار

یعنی ساری کائنات میں خدائے واحد کی ذات یا اس کی صفات یا اس کے افعال یا اُن کے افعال کے آثار (عکوس و اظلال) کے علاوہ نہ کوئی دوسری ہستی موجود ہے اور نہ کوئی ہستی نظر آتی ہے (جب موجود ہی نہیں تو کہاں سے نظر آسکتی ہے)

نوٹ:۔ جب تک اس بنیادی حقیقت کو مدِ نظر نہ رکھا جائے اس وقت تک اقبال کا نصف سے زیادہ کلام سمجھ میں نہیں آسکتا۔ مثلاً اقبال کی اس نظم کا آخری مصرع یہ ہے۔

"کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے"

یعنی خدا کو دیکھنا چاہتے ہو۔ تو اپنے آپ کو دیکھو۔ اقبال نے بانگِ درا سے لے کر اس کتاب تک اپنی ہر تصنیف میں اس بات کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔ اور جب تک اس بنیادی حقیقت کو مدِ نظر نہ رکھا جائے، کوئی شعر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور وہ بنیادی حقیقت یہ ہے کہ

(۱) اس کائنات میں خدا کے سوا اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔
(۲) اس لئے انسان اگر اُس کو دیکھنا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو دیکھ لے۔
(۳) دیکھنے کا طریقہ نہ کسی کالج سے سکھایا جاتا ہے نہ کسی مکتب میں۔ یہ طریقہ نہ کسی

کتاب میں مرقوم ہے، نہ کسی رسالہ میں مذکور ہے۔ بلکہ دیکھنا ایک پوشیدہ ہنر ہے۔ اور یہ پوشیدہ ہنر کسی مردِ کامل کی جوتیاں سیدھی کرنے بلکہ سر پر رکھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔[1]

یہی "دیکھنا" اقبالؔ کے فلسفہ کا خلاصہ ہے اور اس کو انھوں نے ہر کتاب میں نئے رنگ میں نئی اصطلاحوں میں، بلکہ نئے پردوں میں چھپایا ہے۔ تمام اشعار لکھوں تو شرح اپنی حدود سے متجاوز ہو جائے گی۔ اس لئے دو تین شعروں پر اکتفا کرتا ہوں۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

پہلا سوال یہ ہے کہ یہ "من" کیا کوئی سمندر ہے جو اس میں ڈوب جاؤں؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ بفرضِ محال اگر یہ سمندر ہے تو ڈوبوں کیسے؟ ان دونوں سوالوں کا جواب وہی ہے کہ "حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر"

دوسرا شعر سنئیے۔ نغمہ خاموش دارد سازِ وقت
غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت

یہاں بھی وہی سوال ہے کہ اگر دل کوئی سمندر ہے تو اس میں غوطہ کیسے لگاؤں؟ اس کا بھی وہی جواب ہے جو اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ ایک شعر اور بھی سن لیجئے تو پھر اس بحث کو ختم کیا جائے۔

---

[1] جب حضرت امیر خسروؒ اپنے مرشد کی جوتیاں سر پر رکھے ہوئے اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت نے دریافت کیا کتنے میں خریدیں؟ اُنھوں نے جواب دیا "ایک لاکھ روپے میں" اس پر حضرت نے تبسم فرمایا اور کہا "ارزاں خرید کردہ؟"

مصطفےٰ بحر است موجِ او بلند
خیز و ایں دریا بجوئے خویش بند

یہاں بھی وہی سوال ہے کہ اگر سرکارِ دو عالم صلعم سمندر ہیں تو میں اس سمندر کو اپنی نہر میں کیسے جذب کر سکتا ہوں؟ یا سمندر کوزے میں کیسے سما سکتا ہے؟ اس کا بھی وہی جواب ہے کہ کسی کامل سے اس کا طریقہ سیکھو۔

اس زمانے کے مسلمانوں میں ہر قسم کی آرزو پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر نہیں ہے تو یہ آرزو کہ دریا پیالہ میں کیسے سما سکتا ہے۔ ہم خدا کو کیسے دیکھ سکتے ہیں؟

اب رہی یہ بات کہ کیا دیکھنا مسلمان کے لئے ضروری ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے تو واقعی ضروری ہے۔

پہلی آیت:- فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔ پس جو شخص اپنے رب سے ملاقات کی توقع رکھتا ہے۔ اسے لازم ہے کہ وہ اعمالِ صالحہ بجالائے اور اپنے رب کی عبادت (اطاعت) میں کسی کو شریک نہ کرے (۱۸ = ۱۱۰)

دوسری آیت:- يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (اللہ مومن سے بوقتِ وفات خطاب فرماتے ہیں کہ تو اس کے انعام) سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے (۸۹ = ۲۸)

ان دونوں آیتوں سے یہ حقیقت مستنبط ہو سکتی ہے کہ مومنوں کو دیدار کی نعمت ضرور حاصل ہوگی۔ بلکہ یہ نعمت صرف انہی کے لئے مخصوص ہے اسی لئے راقم الحروف کی رائے میں دیدار یا ملاقات یا لقائے الٰہی مومن کا مقصودِ حیات ہے۔

عالمِ برزخ

مردہ اپنی قبر سے

کیا شے ہے! کس امروز کا فردا ہے قیامت؟
اے میرے شبستانِ کہن! کیا ہے قیامت؟

قبر

اے مردۂ صد سالہ! تجھے کیا نہیں معلوم؟
ہر موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت!

مردہ

جس موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت
اس موت کے پھندے میں گرفتار نہیں میں
ہر چند کہ ہوں مردۂ صد سالہ و لیکن
ظلمت کدۂ خاک سے بیزار نہیں میں
ہو روح پھر اک بار سوارِ بدنِ زار!
ایسی ہے قیامت تو خریدار نہیں میں

صدائے غیب

نے نصیبِ مار و کژدم نے نصیبِ دام و دد
ہے فقط محکوم قوموں کے لئے مرگِ ابد

بانگِ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں
روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد
مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

قبر
(اپنے مردے سے)

آہ ظالم! تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا؟
میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک
تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر
تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک!
الحذر محکوم کی میت سے سو بار الحذر
اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک!

صدائے غیب

گرچہ برہم ہے قیامت سے نظامِ ہست و بود
ہیں اسی آشوب سے بے پردہ اسرارِ وجود
زلزلے سے کوہ و در اڑتے ہیں مانندِ سحاب
زلزلے سے وادیوں میں تازہ چشموں کی نمود
ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریبِ تمام
ہے اسی میں مشکلاتِ زندگانی کی کشود

زمین

آہ یہ مرگِ دوام! آہ یہ رزمِ حیات!
ختم بھی ہوگی کبھی کشمکشِ کائنات!
عقل کو ملتی نہیں اپنے بتوں سے نجات!
عارف و عامی تمام بندۂ لات و منات!
خوار ہوا کس قدر آدمِ یزداں صفات!
قلب و نظر پر گراں ایسے جہاں کا ثبات!
کیوں نہیں ہوتی سحر حضرتِ انساں کی رات؟

تمہید۔ اس بغایت مؤثر تمثیلی نظم میں اقبالؔ نے قبر، مُردہ اور صدائے غیب کے مابین مکالمہ قلمبند کیا ہے جس کا مرکزی یا بنیادی تصور یہ ہے کہ:۔

(۱) جن لوگوں نے غلامی کی بدولت اپنی خودی کو ذلیل یعنی مردہ کر دیا ہے وہ مر کر دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ غلامی بعد الموت کی صلاحیت کو فنا کر دیتی ہے۔

(۲) غلامی اتنی بڑی لعنت ہے کہ زمین بھی غلام کی میت سے نفرت کرتی ہے۔

مقصد اس نظم سے یہ ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کے دلوں میں انگریز کی غلامی سے نکلنے کی آرزو پیدا ہو۔ راقم الحروف کی دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ اگر مسلمان نوجوان اس نظم کو بار بار پڑھیں تو مذکورہ بالا مقصد میں کامیابی بالکل یقینی ہے۔

سہولت کے لئے پہلے اس نظم کا خلاصہ لکھتا ہوں پھر وضاحت کروں گا۔

(۱) مُردہ نے قبر سے پوچھا کہ قیامت کسے کہتے ہیں۔

(۲) قبر نے جواب دیا قیامت ہر موت کا پوشیدہ تقاضا ہے۔

(۳) مُردہ نے کہا۔ لیکن افسوس ہے کہ مجھے وہ موت نہیں آئی جس کا پوشیدہ تقاضا قیامت ہے۔

(۴) جب قبر نے یہ جواب سُنا تو وہ بہت پریشان اور متحیر ہوئی۔ کیونکہ اُسے اِس بات کا علم نہ تھا کہ موت کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس کا پوشیدہ تقاضا قیامت نہیں ہے۔ یعنی جس کے بعد زندگی نہیں ہے۔

(۵) اس لئے کارکنانِ قضا و قدر (صدائے غیب) نے یہ صراحت کی۔ کہ اے قبر! یہ مُردہ سچ کہتا ہے۔

ع مر کے جی اُٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام

چونکہ یہ غلام تھا اِس لئے مر کر زندہ نہیں ہو سکتا۔

(۶) یہ سُن کر زمین نے کہا کہ اب میں سمجھی کہ میری خاک اِس قدر سوز ناک کیوں ہے!
اِس کے بعد قبر، عالمِ غیظ و غضب میں اسرافیل کو پکارتی ہے کہ جلد صُور پھونک دے۔ تاکہ مجھے اِس ناپاک میت سے نجات مِل جائے۔

(۷) اِس پر کارکنانِ قضا و قدر نے پھر زمین کو متنبہ کیا کہ اطمینان رکھو قیامت اپنے وقتِ مقررہ پر ضرور آئے گی۔ کیونکہ

ع ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریبِ تمام

(۸) یہ سُن کر زمین نے اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کی کہ اے خدا! ایسا دور کب آئے گا۔ بلکہ کیوں نہیں آتا جبکہ انسان دوسرے انسانوں کی غلامی سے نجات حاصل کر سکے گا۔

اِس نظم کا عنوان ہے "عالمِ برزخ"۔

برزخ کے لغوی معنی ہیں روک یا پردہ، تصوف کی اصطلاح میں برزخ کہتے ہیں۔

اُس شخص کو جس میں دو شانیں پائی جائیں۔ مذہب کی اصطلاح میں برزخ کہتے ہیں مرنے اور جی اُٹھنے کے درمیانی وقفہ کو۔ مثلاً زید کا انتقال ہو گیا تو وفات کے بعد سے نفخ صُور تک وہ جس عالم میں رہے گا اسے عالمِ برزخ کہتے ہیں۔

(۱) مُردہ اپنی قبر سے سوال کرتا ہے کہ قیامت کسے کہتے ہیں۔

(۲) قبر جواب دیتی ہے کہ قیامت کہتے ہیں دوبارہ جی اُٹھنے کو، اور ہر شخص مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوگا۔ کیونکہ یہ تو اس کی شخصیت کا تقاضا ہے یعنی قیامت، موت کا لازمی نتیجہ ہے۔

(۳) یہ سُن کر اُس مردے نے یہ کہا کہ مجھے وہ موت نہیں آئی تھی۔ جس کا پوشیدہ تقاضا قیامت یعنی دوبارہ زندگی ہے۔ اِس کی وضاحت یہ ہے۔ کہ میں تو غلام تھا۔ اِس لئے مجھے وہ موت نہیں آئی جس کے بعد دوبارہ زندگی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ مُردہ ہزار سال گزرنے کے باوجود میں اپنی قبر کی ظلمت سے بیزار نہیں ہوں۔ یعنی میرے اندر دوبارہ زندہ ہونے کی کوئی آرزو پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اور نہ کبھی اس کا امکان ہے۔

(۴) یہ سُن کر قبر بہت متعجب ہوئی کہ یہ کیسا مُردہ ہے جو زندہ ہونا نہیں چاہتا۔ یا اسے کس قسم کی موت آئی ہے جس کے بعد زندگی نہیں ہے۔ تو صدائے غیب نے یہ کہہ کر اُس کی حیرانی کو دُور کیا کہ ہمیشہ کی موت فقط غلام قوموں کے لئے مخصوص ہے، جو لوگ زندگی میں غلام تھے یعنی زندگی سے محروم تھے جن کا بدن زندگی میں بھی رُوح سے خالی تھا۔ وہ مرنے کے بعد کیسے زندہ ہو سکتے ہیں؟ بانگِ اسرافیل (نفخ صور) سے صرف وہ لوگ زندہ ہو سکیں گے، جو مرنے سے پہلے زندہ تھے۔ غلام قوم کے افراد تو زندگی ہی میں مر جاتے ہیں۔ اس لئے وہ دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ آزاد مرد آدمی مر کر زندہ ہو سکتا ہے۔

لیکن غلام مر کر کیسے زندہ ہوگا۔ جبکہ وہ زندہ ہونے کی صلاحیت ہی کھو چکا ہے؟

اگرچہ ہر ذی رُوح کی آخری منزل قبر ہے لیکن قبر سے دوبارہ جی اُٹھنا یہ تو صرف آزاد مردوں کا کام ہے۔ غلام مُردے دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتے۔

(۵) یہ سُن کر قبر نے اُس مُردے سے کہا کہ اب میں سمجھی کہ میری مٹی میں اِس قدر سوزش یا آگ کی خاصیت کیسے پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تُو دُنیا میں غلامی کی لعنت میں گرفتار تھا، یہی وجہ ہے کہ میری تاریکیوں میں اضافہ ہو گیا۔ بلکہ تیرے وجود سے زمین کی شدید توہین ہو گئی۔

میں دُعا کرتی ہوں کہ خدا محکوم کی میت سے ہر قبر کو بچائے! اے اسرافیل جلد صور پھونک تاکہ زمین تہہ و بالا ہو جائے اور میں اِس ناپاک مُردے کے وجود سے پاک ہو جاؤں۔ اے خدا! مجھے اِس مُردے کی ناپاکی سے جلد نجات دے!

(۵) یہ سُن کر کارکنانِ قضا و قدر نے یہ کہا کہ اگرچہ قیامت سے اِس کائنات کا درہم برہم ہو جانا لازمی ہے۔ لیکن یہ آشوب (ہنگامہ) بہت ضروری ہے کیونکہ اس کی بدولت اسرارِ وجود عیاں ہو سکتے ہیں۔ یعنی دنیا میں ہر شخص نے جو جو کام کئے ہیں۔ اُن کے نتائج اُسی کی بدولت ظاہر ہوں گے۔ جس طرح زلزلوں سے پُرانی عمارتیں منہدم ہو جاتی ہیں۔ اور وادیوں میں نئے چشمے نمودار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح قیامت بھی ایک زلزلہ (انقلاب) ہے۔ جس کی بدولت نئی دُنیا عالمِ وجود میں آجائے گی۔ غور کرو! نئی تعمیر سے پہلے پُرانی عمارت کو یکسر منہدم کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ قیامت کے بعد زندگی کو نئی بنیادوں پر استوار کیا جائے گا یعنی حیاتِ انسانی کا نیا دور شروع ہوگا۔ اس لئے اس پُرانے نظام کو بالکل ختم کر دیا جائے گا۔ اسی "تخریب" یا فنائے

کلی میں زندگی کی تمام مشکلات کا حل پوشیدہ ہے۔ وہ اِس طرح کہ مثلاً موجودہ زندگی میں ہم جسم کی قید میں گرفتار ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ آئندہ زندگی کی نوعیت ایسی ہو کہ ہم جسم کی قید سے آزاد ہو جائیں۔

(۶) مُردہ، قبول کارکنانِ قضا، وقدر کی گفتگو سُننے کے بعد، زمین نے یہ تبصرہ کیا کہ غلامی اِس دُنیا میں سب سے بڑی لعنت ہے۔ کیونکہ اِس کا نتیجہ "مرگِ دوام" ہے۔ اور اِس غلامی کا باعث یہ ہے کہ طاقتور قومیں کمزور قوموں پر حکومت کرنا چاہتی ہیں۔ اُن کی عقل انہیں یہ سمجھاتی ہے کہ دوسروں کو اپنا محکوم بنا کر اُن سے مختلف قسم کے فوائد حاصل کرو۔ عقلمند اور بیوقوف سب لوگ اپنی اپنی ذاتی خواہشات کے بندے ہوتے ہیں۔ یعنی خدا کے قوانین کی پابندی کے بجائے اپنی خواہشات کی پرستش کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان، جو صفاتِ ایزدی کا حامل ہے، اِس دُنیا میں بنہایت ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔

چونکہ خداپرست کی نگاہ میں ایسا نظام بلاشبہ نفرت کے لائق ہے جس میں انسان، انسان کا غلام ہو۔ اِس لئے خداپرستوں کا فرض ہے کہ اس کو تہ و بالا کر دیں۔

نوٹ:۔ اقبال نے زمین کی زبان سے خداپرستوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ ایسے ناپاک نظام کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس کے بجائے حکومتِ الٰہیہ قائم کریں۔ جس میں کوئی انسان، کسی دوسرے کا غلام نہ ہو۔

معزول شہنشاہ

ہو مبارک اس شہنشاہِ نکو فرجام کو
جس کی قربانی سے اسرارِ ملوکیت ہیں فاش
شاہ، ہے برطانوی مندر میں اک مٹی کا بت
جس کو کر سکتے ہیں جب چاہیں پجاری پاش پاش!
ہے یہ مشک آمیز افیوں ہم غلاموں کے لئے
ساحرِ انگلیس! مارا خواجۂ دیگر تراش!

تمہید:۔ اِس نظم کا عنوان ہے "معزولِ شہنشاہ" اور اِس سے اشارہ ہے ایڈورڈ ہشتم کی طرف جس نے ۷ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو بخوشی تختِ انگلستان سے دستبرداری کا اعلان کیا تھا۔ اِس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ بادشاہ ایک امریکن مطلقہ خاتون مسز سمپسن سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسقفِ اعظم وزیرِ اعظم اور قوم سب نے اس کی مخالفت کی۔ بادشاہ نے مجبور ہو کر تخت و تاج دونوں کو خیرباد کہہ دیا۔ تاکہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کر سکے۔ علامہ مرحوم نے اِس واقعہ سے متاثر ہو کر یہ یادگار نظم سپردِ قلم کی۔ یعنی ایڈورڈ کی قربانی کو زندہ جاوید بنا دیا۔ کہتے ہیں کہ میں اِس نیک انجام بادشاہ کی خدمت میں ہدیہ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ جس نے اپنے ضمیر کی آزادی برقرار رکھنے کے لئے اپنے تخت و تاج کو قربان کر دیا۔ اور اِس قربانی سے ملوکیت کی حقیقت اہلِ دنیا پر واضح کر دی کہ انگریزوں کی نگاہ میں، بادشاہ کی حیثیت بالکل مٹی کے اُس بُت کی سی ہے۔ جسے پجاری جب چاہیں پاش پاش کر دیں۔ دراصل اُن کی نگاہ میں،

بادشاہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ (وہ اپنی رفیقۂ حیات بھی اپنی مرضی سے منتخب نہیں کر سکتا) یہ ڈھونگ اُنہوں نے محض ہم غلاموں کو قابو میں رکھنے کے لئے رچا رکھا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے اس بادشاہ کو جو اُن کی مرضی کے مطابق نہیں تھا یک بینی و دوگوش، خارج البلد کر دیا۔ اور ہمیں مرعوب کرنے کے لئے دوسرے بادشاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔

دوزخی کی مناجات

اس دیرِ کہن میں ہیں غرض مند پجاری
رنجیدہ بتوں سے ہوں تو کرتے ہیں خدا یاد
پوجا بھی ہے بے سود، نمازیں بھی ہیں بے سود
قسمت ہے غریبوں کی وہی نالہ و فریاد
ہیں گرچہ بلندی میں عمارات فلک بوس
ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانۂ آباد
تیشے کی کوئی گردشِ تقدیر تو دیکھے
سیراب ہے پرویز، جگر تشنہ ہے فرہاد
یہ علم، یہ حکمت، یہ سیاست، یہ تجارت
جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد
اللہ! ترا شکر کہ یہ خطۂ پرسوز
سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد!

اِس تمثیلی نظم میں اقبال نے ایک دوزخی کی زبان سے اِس حقیقت کا اعلان کیا ہے، کہ یورپین اقوام کی رقابتِ باہمی کے جذبے نے انسانوں کی زندگی تلخ کر دی ہے۔ بلکہ "دوزخی" کی رائے میں یہ دُنیا دوزخ سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔ دوزخ کی زندگی اِس دُنیا کی زندگی سے بہتر ہے۔ اور یہی وہ مرکزی خیال ہے۔ جسے اقبال ہمارے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) ایک دوزخی خدا سے دُعا کرتا ہے کہ اے خدا! دُنیا میں جس قدر انسان آباد ہیں سب غرض مند ہیں۔ یہ لوگ دراصل تیرے بجائے بُتوں کی پُوجا کرتے ہیں۔ اور مجھے صرف اُس وقت یاد کرتے ہیں جب اپنے بُتوں سے رنجیدہ یا مایوس یا ناراض ہو جاتے ہیں۔

لفظِ بُت کے دو معنی ہیں (۱) خواہشِ نفس (۲) آقا یا حکمران۔ انسان خدا کو اسی وقت یاد کرتا ہے۔ جب اُس کی خواہش پوری نہیں ہوتی یا آقا سے توقعات پوری نہیں ہوتیں۔ ایک شاعر نے اسی مضمون کو اس مصرع میں ادا کیا ہے۔

ع جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

(۲) چونکہ دُنیا والوں نے تجھے چھوڑ دیا۔ اور اپنی خواہشات یا حکمرانوں کو اپنا معبود بنا لیا۔ اِس لئے اب نہ ہندوؤں کی پوجا پاٹ سے اِن کو کوئی نفع حاصل ہوتا ہے۔ اور نہ مسلمانوں کی نماز سے اِن کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

چونکہ بنی آدم کی حماقت اور جہالت کی بدولت طاقتور اقوام اُن پر غلبہ حاصل کر چکی ہیں۔ اِس لئے اب پوجا اور نماز دونوں بے سود ہو کر رہ گئی ہیں۔ عوام دن رات نمازیں پڑھتے ہیں۔ لیکن غلامی کی زنجیریں روز بروز سخت ہوتی چلی جاتی ہیں۔

کیا خوب کہا ہے

قسمت ہے غریبوں کی وہی نالہ و فریاد

(۳) اگرچہ حکمرانوں نے، مفتوحہ ممالک کے بڑے بڑے شہروں میں نہایت عالیشان (فلک بوس) عمارات تعمیر کردی ہیں۔ اور شہروں کو باغوں، کلبوں، کالجوں، بنکوں، سینماؤں، رقص گاہوں اور ہوٹلوں کی بدولت رشکِ جنت بنا دیا ہے۔ لیکن اے خدا! سچ تو یہ ہے۔ کہ ہر شہر درحقیقت ایک ویرانہ ہے جو نادانوں یا ظاہر بینوں کو آباد نظر آتا ہے۔ کیونکہ ہر شہر میں ہزاروں مریض، بے روزگار، علاج اور تیمارداری کے فقدان سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ہزاروں عورتیں ہر روز روٹی کے لئے عصمت فروشی کرتی ہیں۔

ہزاروں مرد مفلسی سے تنگ آکر خودکشی کر لیتے ہیں یا ضمیر فروشی کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ہزاروں بچے تعلیم و تربیت سے محروم ہیں اور گلی کوچوں میں آوارہ پھرتے ہیں۔ ہزاروں خاندان اسبابِ معیشت سے محروم ہیں اور ہر قسم کے مصائب کا شکار ہیں۔

(۴) اے خدا! مزدوری و کاشتکاری (پیشہ کی گردش) تقدیر (بدقسمتی) کا تجھ سے کیا حال بیان کروں! حکمران طبقہ (یہودی اقتدار) سے مزدوروں اور کاشتکاروں کا خون چوستا چلا آرہا ہے۔ اور مزدور (فرہاد) قدیم الایام سے سرمایہ دار کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔

(۵) اے خدا! اس میں شک نہیں کہ انگریزوں اور دوسری یورپین اقوام نے مفتوحہ ممالک میں کالج، سکول، ریسرچ انسٹیٹیوٹ اور مختلف اقسام کے تحقیقاتی ادارے قائم کردیے ہیں۔ لیکن یہ تمام درسگاہیں یہ تمام تجارتی کارخانے سب اسی نظامِ ملوکیت کی تائید اور تقویت کے لئے وقف ہیں جس کا مقصد یہ ہے۔ کہ بندوں کو تیری غلامی کے بجائے انسانوں کی غلامی کا درس دیا جائے اور غلام بنا کر ان کو انسانیت کے

ابتدائی حقوق سے بھی محروم کر دیا جائے۔

اے خداوندا! اندریں حالات میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ خطۂ پرسوز، یہ جہنم جس میں قیامت کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یہ دوزخ جس میں کھولتا ہوا پانی پینے کو ملتا ہے، سوداگرِ یورپ کی غلامی سے آزاد ہے۔ اس میں ہزاروں مصائب سہی لیکن تیرا شکر ہے کہ یہاں غلامی کی لعنت تو نہیں ہے۔ کم از کم ہم دوزخی انگریزوں کی غلامی سے تو آزاد ہیں۔

بنیادی تصور یہ ہے۔ کہ غلامی کی زندگی، دوزخ کی زندگی سے بھی بدتر ہے کاش مسلمانانِ عالم اس نکتہ کو سمجھ سکیں۔ اور یورپ کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لئے کوئی منظم جدوجہد کرسکیں۔ کاش سلطان ابن سعود پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ غلامی کی زنجیروں کو توڑنا، قبور کے توڑنے سے ہزار گنا زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ یورپ اور امریکہ کی غلامی قبر پرستی سے بھی بدتر ہے۔

مسعود مرحوم

یہ مہر و مہ یہ ستارے یہ آسمانِ کبود
کسے خبر کہ یہ عالم عدم ہے یا کہ وجود!
خیالِ جادہ و منزل فسانہ و افسوں
کہ زندگی ہے سراپا رحیلِ بے مقصود!
رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود

زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اسکی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود!
مجھے رُلاتی ہے اہلِ جہاں کی بیدردی
فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود!
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غم دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود!
دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است (سعدیؒ)
نہ مجھ سے پوچھ کہ عمرِ گریز پا کیا ہے
کسے خبر کہ یہ نیرنگ و سیمیا کیا ہے
ہوا جو خاک سے پیدا وہ خاک میں مستور
مگر یہ غیبتِ صغریٰ ہے یا فنا! کیا ہے؟
غبارِ راہ کو بخشا گیا ہے ذوقِ جمال
خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے
دل و نظر بھی اسی آب و گل کے ہیں اعجاز؟
نہیں، تو حضرتِ انساں کی انتہا کیا ہے؟
جہاں کی روحِ رواں لا الٰہ الا ھو،
مسیح و میخ و چلیپا یہ ماجرا کیا ہے؟

قصاصِ خونِ تمنا کا مانگیے کس سے
گناہ گار ہے کون اور خوں بہا کیا ہے!
غمیں مشو کہ بہ بندِ جہاں گرفتاریم
طلسمہا شکند آں دلے کہ ما داریم!
خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات!
خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا
ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل و فرات!
خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہِ پیشِ نسیم
خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات!
نگاہ ایک تجلی سے ہے اگر محروم
دو صد ہزار تجلی تلافیٔ مافات!
مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر
زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات!
حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی
نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات!
خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند!

تمہید:- یہ وہ مرثیہ ہے جو علامہ مرحوم نے اپنے محسن اور قدردان بلکہ عاشق سر راس مسعود کی وفات پر لکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم جسٹس محمود مرحوم کے بیٹے اور سرسید مرحوم کے پوتے تھے۔ جب مرحوم نے ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ کی وائس چانسلری سے استعفا دیا۔ تو نواب صاحب بھوپال نے اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر ان کو بھوپال بلاکر وزیر تعلیم مقرر کردیا۔ مرحوم کو علامہ سے غیر معمولی محبت تھی۔ چنانچہ اُسی محبت کی زنجیر نے جنوری ۱۹۳۵ء میں علامہ کو لاہور سے بھوپال کھینچ لیا۔ اور اس کے بعد جولائی ۱۹۳۵ء میں علامہ بغرض علاج بھوپال جاکر مرحوم کے مہمان ہوئے تھے۔ مرحوم ہی کی کوششوں سے نواب صاحب بھوپال نے علامہ کا علمی وظیفہ مقرر کیا تھا۔

جون ۱۹۳۷ء میں علامہ نے مرحوم کو خط لکھا تھا۔ کہ میں چاہتا ہوں کہ شیخ عبدالغنی مرحوم کی جگہ تم کو اپنے بچوں کا جو تھا ولی مقرر کردوں۔ اِس کے جواب میں مرحوم نے یہ لکھا جو تمھے گارڈین کی بابت میری رائے یہ ہے کہ چونکہ نہ میں لاہور میں رہتا ہوں۔ اور نہ کوئی اُمید لاہور کے قریب رہنے کی ہے۔ تو مجھے ولی مقرر نہ کرو۔ البتہ اپنی وصیت میں یہ ضرور درج کرو۔ کہ اگر کوئی مالی ضرورت پیش آئے تو پہلے میں مطلع کیا جاؤں۔ میں ہر ممکن طریقے سے مدد دینے کے لئے تیار ہوں۔ بشرطیکہ میں خود زندہ رہا۔ یہ خود ایک بڑی ذمہ داری ہیں اپنے اُوپر اس عشق کے ثبوت میں لے رہا ہوں جو مجھے تم سے ہے۔

اس آخری سطر سے معلوم ہوسکتا ہے کہ علامہ اور راس مسعود کے باہمی تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ تقدیر کی نیرنگی ملاحظہ ہو۔ کہ اس خط کے ڈیڑھ ماہ کے بعد سر راس مسعود کا انتقال ہوگیا۔ اقبال کو اُن کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ میرے اس قیاس

کا ثبوت اُس جملہ سے مل سکتا ہے۔ جو اُنہوں نے لیڈی مسعود کو تعزیتی خط میں لکھا تھا۔ میں آپ کو صبر کی تلقین کیونکر کروں جبکہ میرا دل تقدیر کی شکایتوں سے خود لبریز ہے۔

ناظرین اس جملہ کے مفہوم پر غور کریں۔ یہ جملہ وہ شخص لکھ رہا ہے جس نے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۶ء تک دُنیا کو ضبط۔ تحمل اور استقلال کا درس دیا تھا۔

اقبال کی تنقیص مدِّنظر نہیں ہے۔ بس اس حقیقت کا اظہار کرنا مقصود ہے کہ صرف نبی یا رسول ہی اپنے قول پر عمل کر کے دکھا سکتا ہے۔ غیر نبی خواہ وہ کتنا ہی عظیم الشان انسان کیوں نہ ہو، اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ بات یہ ہے کہ جب انسان پر چاروں طرف سے مصائب کا ہجوم ہوتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ اُس کی آرزوؤں اور تمناؤں میں سے ایک بھی پوری نہ ہوئی جن کے لئے ساری عمر جدوجہد کی تھی تو دامنِ صبر بے اختیار ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور اس طرح انسان اپنے طرزِ عمل سے قرآن کی اس آیت کی صداقت واضح کردیتا ہے۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا ط بیشک انسان بہت کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

نظم کا تجزیہ:- اس نظم کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں جو تیرہ (۱۳) اشعار پر مشتمل ہے شاعر نے اپنی قنوطیت (مایوسی اور ناکامی) کا غیر مبہم انداز میں اظہار کیا ہے۔ یہ رنگ بالکل "غیر اقبالی" ہے کیونکہ علامہ نور رجائیت کے علمبردار ہیں۔ لیکن ان اشعار میں فطرتِ انسانی کا ایسا صحیح عکس پایا جاتا ہے کہ اُن پر نقائص کا الزام عائد کرنے کے بجائے اُن کی صداقت پسندی پر خراجِ تحسین ادا کرنے کو دل چاہتا ہے۔ واقعی جب انسان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے تو وہ کتنا ہی بڑا "رجائی" کیوں نہ ہو۔ تھوڑی دیر کے لئے تو ضرور ہی

"قنوطی" ہو جاتا ہے۔

دوسرے حصے میں جو آٹھ اشعار پر محتوی ہے، شاعر نے اپنے جذبات پر قابو حاصل کر کے، پھر دُنیا کو اپنا اصلی پیغام دیا ہے کہ:-

"خودی ہو زندہ تو ہے موت اِک مقامِ حیات"

اور یہی مصرع اِس نظم (مرثیہ) کی جان یا بنیادی تصور ہے، اِس مختصر تمہید کے بعد اب میں ہر شعر کا مطلب جدا جدا بیان کرتا ہوں:-

(۱) و (۲) جیسا کہ میں نے تمہید میں لکھا ہے، شدتِ غم سے شاعر پر عالم یاس طاری ہو گیا ہے۔ اس لئے ان شعروں میں "قنوطیت" کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ دُنیا میں کسی شئے کو ثبات یا قرار نہیں ہے۔ ہر طرف فنا کا بازار گرم ہے۔ اس لئے کوئی شخص یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ دُنیا واقعی خارج میں موجود ہے۔ یا محض فریب نظر ہے۔ خدا ہی جانے کہ حقیقت کیا ہے۔ جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے وہ تو یہ ہے کہ ہر شخص کچھ عرصہ کے لئے یہاں آتا ہے۔ اور اس کے بعد نگاہوں سے غائب ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی ایک ایسا سفر معلوم ہوتی ہے جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ اندریں حالات فلاسفہ کا یہ نظریہ کہ یہ دُنیا دار العمل ہے۔ اور انسان کی زندگی کا ایک خاص مقصد ہے بالکل مہمل اور غیر حقیقی معلوم ہوتا ہے۔

(۳) افسوس آج دُنیا سے سر سید احمد خاں و جسٹس محمود کی یادگار بھی مٹ گئی۔

(۴) بلاشبہ مسعود ہماری ملت کا ایک نامور فرزند تھا۔ اس کا وجود قوم کے حق میں بہت مفید تھا۔ اس کی ناگہانی موت سے قوم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔

(۵) یہ دُنیا والے بھی کس قدر ظالم اور حق ناشناس ہیں کہ بلبل تو ہر روز صبح کے وقت

گل کی بے ثباتی پر نوحہ خوانی کرتی ہے لیکن وہ اسے نغمہ سرائی سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۶) و (۷) میں اپنے دوست کی جدائی میں خون کے آنسو رو رہا ہوں۔ لوگ مجھے صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن وہ غلطی پر ہیں۔ صبر سے غمِ دوست کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ اور نہ صبر کرنے سے موت کا معمہ حل ہو سکتا ہے کیا خوب کہا ہے سعدیؒ نے کہ جو شخص کسی کا عاشق ہو اور وہ اُس کی جدائی پر صبر بھی کر سکے تو سمجھ لو کہ اُس کے سینے میں دل نہیں ہے۔ بلکہ پتھر کا ٹکڑا رکھا ہوا ہے۔ کیونکہ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ عاشق اور صبر میں ہزاروں فرسنگ کا فاصلہ ہوتا ہے یعنی عاشق کے لئے ناممکن ہے، کہ وہ اپنے معشوق کی جدائی پر صبر کر سکے۔

(۸) ان شعروں میں بھی رو بہی "لا ادریت اور قنوطیت" کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

(۹) جو ابتدائی اشعار میں پایا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں انسانی زندگی کی حقیقت سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ ہمیں تو انسانی زندگی بالکل دھوکہ یا شعبدہ نظر آتی ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

(۱۰) ہر انسان اتنی بات تو یقینی طور پر جانتا ہے۔ کہ جو شخص خاک سے پیدا ہوتا ہے وہ انجام کار خاک میں پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جس بات کا ہمیں یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا وہ یہ ہے کہ یہ "خاک میں مستوری" عارضی ہے یا ہمیشہ کے لئے ہے۔ یعنی میرے مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ہوگی یا نہیں؟

نوٹ:- "غیبت صغریٰ" شیعہ مذہب کی اصطلاح ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ شیعوں کے عقیدے کے مطابق اُن کے بارہویں امام حضرت محمد الملقب بہ مہدیؑ ۲۶۴ھ میں مصلحتاً لوگوں کی نظروں سے غائب ہو گئے۔ اور بوقت غیبت عثمان ابن سعید کو اپنا وکیل مقرر کر گئے۔ ۳۲۹ھ تک وکلاء کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد غیبت کبریٰ

شروع ہوگئی جو ہنوز قائم ہے بن ۱۲۶۳ھ سے سن ۱۲۷۲ھ تک کے زمانے کو عیسیٰ معغربی کہتے ہیں اقبالؔ نے عیسیٰ مغربی سے عارضی طور پر پوشیدہ ہونا مراد لیا ہے۔

(۱۱) و (۱۲) اس شعر سے شاعر اپنے سابقہ خوطی رنگ کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر یہ بات یقینی ہے کہ اگرچہ انسان، بنا بریں، یعنی فانی ہے۔ لیکن اس میں ”ذوقِ جمال“ پایا جاتا ہے۔ یعنی اس میں غیر فانی ہونے کی آرزو موجود ہے۔ اور عقل اس جذبہ کی توجیہہ پیش نہیں کرسکتی۔ کہ محدود میں غیر محدود ہونے کی اور فانی میں باقی ہونے کی یہ آرزو کہاں سے آگئی اور کس لئے آگئی؟

”ذوقِ جمال“ بہت بلیغ ترکیب ہے۔ اس سے حیاتِ انسانی کا وہ پہلو مراد ہے جو سراسر غیر مادی ہے۔ یعنی روح اور اُس کے مختلف مظاہر مثلاً جذباتِ عشق و محبت جو ذراتِ مادی کی ترکیب کا نتیجہ نہیں ہوسکتے۔ انہی جذبات و احساساتِ عالیہ کو اقبالؔ نے دوسرے شعر میں دل و نظر سے تعبیر کیا ہے۔

انسان کا جسم اور جسمانی زندگی بیشک مادی ہے لیکن اس مادی زندگی کے علاوہ اس میں روحانی زندگی بھی پائی جاتی ہے۔ اور اس زندگی کا سب سے بڑا مظہر یہ جذبہ ہے کہ وہ اپنے اندر غیر محدودیت کا رنگ پیدا کرنا چاہتی ہے اور یہ چاہت نہ مادی ہے۔ نہ ذراتِ مادی کا نتیجہ ہوسکتی ہے۔ کیونکہ مادہ میں جسم تو پایا جاتا ہے، جذباتِ عالیہ نہیں پائے جاتے۔

شاعر کہتا ہے۔ کہ کیا دل و نظر بھی ذراتِ مادی کی ترکیب (آب و گِل) کا نتیجہ ہوسکتے ہیں۔ پھر خود جواب دیتا ہے۔ کہ نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد دوسرا سوال کرتا ہے۔ کہ اگر انسان کی روح غیر مادی ہے۔ تو پھر اس کی انتہا کیا ہے؟ اس کا جواب محذوف ہے۔

یعنی یہ ہے۔ کہ جب انسان کی حقیقت مادی نہیں ہے بلکہ روحانی ہے۔ تو اس کی انتہا فنائے کلی نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کی روح مرنے کے بعد بھی زندہ رہے گی۔ اسی خیال کو استفہامی رنگ میں اقبالؔ نے اس شعر میں واضح کیا ہے:۔

اگر مقصودِ کُل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے
میرے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہا کیا ہے

ان دونوں شعروں کا مطلب یہی ہے کہ انسان کی زندگی کی کوئی انتہا نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی خودی، مادی یا فانی نہیں ہے۔ بلکہ پرتو ہے ذاتِ باری کا۔ اس لئے فنا سے پاک ہے۔

حضرتِ انسان کی انتہا یہ ہے کہ اگر وہ اپنی خودی کی معرفت حاصل کرلے تو اُسے معلوم ہوجائے گا۔ کہ میں فانی یا مادی نہیں ہوں۔ بلکہ کرشمہ ہوں خدا کی خالقیت کا۔ اور مجھ میں یہ طاقت ہے کہ میں لازوال ہوسکتا ہوں۔

(۱۳) و (۱۴) ان شعروں میں اقبالؔ نے عقل کی بیچارگی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب اللہ کے سوا اور کوئی ہستی اس کائنات پر متصرف اور حکمران نہیں ہے اور وہی اس کائنات کی روحِ رواں ہے۔ ہم سب اُس کی صفتِ خالقیت کا پرتو ہیں۔ اور اُسی کے سہارے سے زندہ ہیں، وہی ہر شئے میں جلوہ گر ہے تو کفار کو یہ قدرت کس طرح حاصل ہوگئی۔ کہ انہوں نے اُس کے رسول کو صلیب پر لٹکا دیا؟ اس نوعیت کے بہت سے واقعات دُنیا میں رُونما ہوتے رہتے ہیں۔ جن کی توجیہہ میں ہماری عقل بالکل عاجز ہے۔ اگر اذنِ الٰہی کے بغیر کوئی ذرّہ حرکت نہیں کرسکتا۔ تو یہودیوں نے نصاریٰ کی تمناؤں کا خون کس کے حکم سے کیا؟ ان حالات گنہگار کس کو قرار دیا جائے گا۔ اور خون بہا کس سے لیا جائیگا۔

مسیحؑ کے علاوہ اس دُنیا میں آئے دن بہت سے نکوکار مبتلائے آلام ہوتے رہتے ہیں۔ اور اُن کی تمناؤں کا خون ہوتا رہتا ہے۔ لیکن انسانی عقل ہرگز نہیں بتا سکتی کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور اس کا مداوا کس طرح کیا جائے؟ کس کو گنہگار قرار دیا جائے اور کس سے خون بہا طلب کیا جائے؟

(۱۵) ان حالات کے پیشِ نظر اقبالؔ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ پریشان ہونے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ کہ ہم دُنیا کی قید میں گرفتار ہیں۔ اور اس کا کوئی مداوا نہیں کرسکتے اگر انسان مسلکِ عشق اختیار کرلے تو ساری مشکلات حل ہوجائیں گی۔ کیونکہ عشق کی بدولت اس خودداری میں اس قدر طاقت پیدا ہوجائیگی۔ کہ وہ دُنیا کے طلسم کو باطل کردے گا۔ اور مادیات سے بالاتر ہو کر ابدی زندگی حاصل کرلے گا۔ چنانچہ اقبالؔ نے اگلے شعروں میں اسی نکتہ کی وضاحت کی ہے۔

کہتے ہیں کہ اے مخاطب! اگر تو نے اتباعِ رسولؐ کی بدولت اپنی خودی کو مستحکم (زندہ) کرلیا ہے۔ تو پھر تیرے لئے موت، زندگی کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ تیری زندگی ہی کا ایک پہلو ہے۔ یعنی موت کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ بھی تیری زندگی کی ارتقائی منازل میں سے ایک منزل ہے۔ وہ ایک دروازہ ہے جس میں سے گذر کر تو زندگی کی اعلیٰ اور ارفع حالت میں داخل ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ انسان کو موت سے سابقہ کیوں پڑتا ہے؟ یعنی موت کا فلسفہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ:۔

(A) انسان، بقائے دوام کا طالب ہے۔ اور اس کا حصول عاشقی پر موقوف ہے۔

(B) اس لئے طالب یعنی مسلمان، طریقِ عاشقی اختیار کرتا ہے۔

(C) عشق کی فطرت کا تقاضا ہے۔ کہ وہ عاشق کا امتحان لیتا ہے۔ یعنی یہ دیکھنا چاہتا ہے۔ کہ عاشق میں شانِ ثبات (صفتِ دوام) پیدا ہوئی ہے یا نہیں۔

(D) انسان کی نظر میں کوئی چیز موت سے زیادہ ہیبتناک نہیں ہے۔

(E) اس لئے عشق اسی ہیبتناک شئے سے خودی کے ثبات کا امتحان کرتا ہے یعنی وہ دیکھتا ہے کہ عاشق کی خودی اس قدر مستحکم ہوگئی ہے یا نہیں کہ موت کا صدمہ برداشت کرسکے؟ اگر پختہ ہوچکی ہے تو یقیناً تصادم (صدمہ) کے بعد ہوش میں آجائیگی۔

؏ خودی چوں پختہ گردد لازوال است

نوٹ:۔ جب تک کوئی اُمیدوار بی اے کے امتحان میں کامیاب نہ ہو یونیورسٹی اُسے گریجویٹ ہونے کی سند نہیں دے سکتی۔ اسی طرح جب تک کوئی مسلمان عاشقی کے امتحان میں کامیاب نہ ہو۔ بارگاہِ خداوندی سے اُسے ایمان کی سند نہیں مل سکتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں اعلان فرمادیا ہے:۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۶۷:۲)

یعنی اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ تمہارا امتحان کرلے کہ تم میں کون کون عمل صالح بجالاتا ہے۔

(۱۶) اے مسلمان! اگر تیری خودی زندہ ہے یعنی اگر تو نے عشقِ رسولؐ کی بدولت اپنی خودی کو مستحکم کرلیا ہے۔ تو اس میں لامحدود ترقی کی صلاحیت پیدا ہوجائے گی (تیرا دریا بیکراں ہوجائے گا)۔

واضح ہو کہ اقبالؔ کی اصطلاح میں خودی کی زندگی سے ہمیشہ استحکامِ خودی مراد ہوتا ہے۔

نوٹ:۔ یہ تصور بھی قرآنِ کریم کی اس آیت سے ماخوذ و مقتبس ہے۔

مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ اگر تم نے ابتک خودی کو مستحکم نہیں کیا تو مایوس مت ہو۔ بلکہ اٹھو اور اب اِس مقدس فریضہ کو انجام دینا شروع کر دو کیونکہ

اے مسلمانوں! ہمت سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کا فیض بند ہو چکا ہے۔ اور اب کوئی سلطان نور الدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی پیدا نہیں ہوگا نہیں تمہارا یہ قیاس بالکل غلط ہے۔ اگر تم نے اپنی غفلت کی بنا پر اپنے آپ کو "ایک تجلی" سے محروم کر دیا۔ تو افسردہ یا آزردہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی تجلیات تو ہر لحظہ بارش کی طرح دنیا اور دنیا والوں پر نازل ہوتی رہتی ہیں۔ تم اولین فرصت میں اُن سے استفادہ کی کوشش کرو اور اس کی صورت یہ ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ محبت استوار کر لو۔

نوٹ:۔ تلافیٔ مافات کے لغوی معنی ہیں کسی نقصان کا بدل کرنا یا معاوضہ دینا۔

(۱۹) تا (۲۱) اِن آخری تین شعروں میں اقبال نے مومن کا مقام واضح کیا ہے کہ بے شک دُنیا میں بعض اوقات ایسے واقعات اور حادثات رونما ہو جاتے ہیں جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ حق مغلوب ہو گیا اور باطل کو فتح نصیب ہو گئی۔ یا یہ کہ مومن کو اپنی جد و جہد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ یا اِس کو سرفروشی کا کوئی صلہ نہیں ملا۔

مثلاً کربلا کے میدان میں بظاہر امام حسینؓ کو یزید کے مقابلہ میں ناکامی ہوئی۔ لیکن اقبال کہتے ہیں کہ مومن کا مقصدِ حیات، دُنیاوی حشمت و جاہ یا مادی کامیابی نہیں ہے بلکہ حصول رضائے باری تعالیٰ ہے۔ اگر دُنیاوی حکمرانی یا مادی کامیابی حاصل ہو جائے تو یہ ایک جداگانہ بات ہے۔ جس کا انحصار سراسر اللہ کی مشیت پر ہے۔ مثلاً سلطان نور الدین زنگی کو کامیابی حاصل ہوئی اور سلطان ٹیپو شہیدؒ کو شکست نصیب ہوئی۔

لیکن اگر حکومت حاصل نہ ہو تو کچھ پرواہ نہیں ہے کیونکہ حکومت مقصود نہیں ہے۔ اور جو مقصود ہے۔ وہ سیدنا امام حسینؓ اور سلطان ٹیپو شہیدؒ دونوں کو حاصل ہو گیا۔ یعنی خوشنودیٔ باری تعالیٰ۔

اقبال کہتے ہیں کہ مومن کا مقام آسمان سے آگے ہے یعنی اُس کی منزلِ مقصود تو وہ "حریم ذات" یعنی اللہ تعالیٰ ہے، مومن تو خدا سے کمتر کسی شئے سے مطمئن ہو ہی نہیں سکتا۔

مردِ مومن در نسازد با صفات
مصطفیٰ راضی نہ شد اِلّا بذات

یہ نکتہ اقبال نے اپنے مرشد، مولینا رومؒ سے سیکھا ہے کہ مومن کا مقصود صرف ذاتِ باری ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات میں تو کوئی شئے اُس سے افضل اور اعلیٰ ہے ہی نہیں تو وہ ادنیٰ کو مقصود کیسے بنائے؟

ما ز فلک برتریم وز ملک افزوں تریم
زیں دو چرا نگذریم، منزلِ ما کبریاست

یعنی ہماری منزلِ مقصود یہ دُنیا نہیں ہے۔ بلکہ ذاتِ خداوندی ہے خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مومن کا نشیمن ابدی، نہ تو یہ دُنیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کی جلوہ گاہ ہے (جس دن تجلیات کا نزول بند ہو جائے گا یہ دُنیا ختم ہو جائے گی) اور نہ لحد تیرا کی خاک تیرہ ہے بلکہ اُس کا ٹھکانا تو "حریمِ ذات" ہے۔ یعنی وہ تو اپنے اندر خدائی صفات کا رنگ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور اسی کا نام روحانی ترقی ہے، اور اس کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔

لیکن اِس کے لئے یہ ضروری ہے کہ مسلمان اِس دُنیاوی زندگی میں اپنی خودی کی معرفت حاصل کر لے۔ تاکہ اِس خاکدان سے باہر نکل سکے یعنی طلسمِ زمان و مکان کو باطل کر سکے اور اس لائق ہو سکے کہ خدائی صفات اُس میں منعکس ہو سکیں۔

نوٹ:۔ بعض کوتاہ بین حضرات، جن کو نہ اسلام سے آگاہی ہے۔ نہ اقبال سے یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اقبال کا نصب العین چونکہ "خدا طلبی" ہے۔ اِس لئے اِس نے معاشی اور مادی زندگی کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ مصرع نقل کر دیتے ہیں کہ۔

○ مقامِ بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر ○

یعنی مومن وہ ہے جو دُنیا سے بے تعلق ہو جائے۔

واضح ہو کہ یہ اعتراض سراسر غلط فہمی یا ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اسلام یا اقبال نے کسی جگہ ترکِ دُنیا یا معاش سے بے نیاز ہونے کی تعلیم نہیں دی۔ بلکہ قرآن حکیم نے تو دُنیاوی بھلائیوں کو دینی بھلائیوں کے حصول پر مقدم رکھا ہے۔ کیونکہ بھوکا آدمی خدا پرستی نہیں کر سکتا۔ اِس کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اپنی معاش کے لئے کسی انسان کا محتاج نہ ہو۔

اقبال نے اگر بندۂ مومن کا مقام "ورائے سپہر" قرار دیا ہے تو اِس کا مطلب

ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار
اے ہمارے رب ہم کو دُنیا میں بھی نیکیاں عطا کر اور آخرت میں بھی نیکیاں عطا کر اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔ (۲۰۱:۲)

فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ یعنی جو لوگ ایمان لائے اور اُس کے بعد انھوں نے حضورؐ کی اتباع کی جسے قرآن میں عمل صالح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تو آخرت میں انہیں ایسا اجر ملے گا۔ جو کبھی ختم نہ ہوگا (۶:۹۵)

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو اپنی خودی کو مستحکم کرے گا تو دُنیا کی مختلف قومیں (دریائے نیل اور دریائے فرات) تیری پناہ میں آئے اور تجھ سے رابطہ و اتحاد پیدا کرنے کی آرزو کا اظہار کریں گی۔

نوٹ:۔ چونکہ حضرت عالمگیرؒ کی خودی زندہ تھی، اس لئے دُنیا کے بڑے بڑے باجبروت بادشاہ اُن سے دوستی کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ اور اُنہی کے پوتے محمد شاہ کی خودی چونکہ مر چکی تھی۔ اِس لئے نادر شاہ نے دوست بنانے کے بجائے اُس کو اپنا غلام بنا لیا۔ اور اُس نے یہ کوئی نئی بات نہیں کی ہر طاقتور کمزور کو اپنا غلام بنا لیتا ہے۔

(۱۷) اے مسلمان! اگر تیری خودی مُردہ ہو چکی ہے۔ تو دُنیاوی حوادث کے سامنے تیری وہی حیثیت ہو گی۔ جو نسیم کے سامنے گھاس کی پتی کی ہوتی ہے۔ اور اگر تیری خودی زندہ ہے تو پھر ساری کائنات تیری تابع فرمان ہو جائے گی۔

نوٹ:۔ آج امریکہ اور انگلستان کے سامنے مصر، حجاز، فلسطین، شام، عراق، ایران، افغانستان اور پاکستان کی حیثیت "مگاہ" سے زیادہ تو نہیں ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ ان ملکوں کے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی خودی بالکل مردہ ہو چکی ہے"

(۱۸) خودی کی حقیقت، اہمیت اور قدر و قیمت واضح کرنے کے بعد آخر میں اقبال

یہ ہے کہ مومن کی نگاہ میں "شکم" مقصدِ حیات نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

مارکس اور لینن کی رائے میں انسان کا مقصدِ حیات شکم ہے لیکن اقبالؔ ان دونوں سے ارفع اور اعلیٰ نصب العین پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شکم اور اس کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہے۔ لیکن اگر ہم اسی کو مقصدِ حیات بنا لیں تو پھر ہم میں اور حیوانات میں کیا فرق رہے گا۔ انسان میں حیوانات سے بڑھ کر ایک چیز پائی جاتی ہے۔ جسے ہم "ذوقِ جمال" سے تعبیر کرتے ہیں۔ پس انسان کا مقصود تسکینِ شکم نہیں ہے بلکہ تسکینِ "ذوقِ جمال" ہے۔ افسوس کہ مارکس اور لینن کی نگاہ اس بلند مقام تک نہ پہنچ سکی۔ اور یہ دونوں فلسفی شکم ہی کے تقاضوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ اسی لئے اقبالؔ کو یہ کہنا پڑا۔

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم

آوازِ غیب!

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک؟
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق؟
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟

تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں
نے گرمیِ افکار، نہ اندیشۂ بیباک!
روشن تو وہ ہوتی ہے جہاں بیں نہیں ہوتی
جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہے نگہِ پاک!
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری!
اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری!

تمہید۔ اس تمثیلی نظم میں اقبالؔ نے "عرشِ بریں" کی زبان سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ مسلمان

(۱) جوہرِ ادراک سے عاری اور علم سے بیگانہ ہو چکا ہے۔

(۲) تحقیق اور تلاش (ریسرچ) اور ایجادات و اختراعات کی دولت سے یکسر محروم ہو چکا ہے۔ بلکہ ان باتوں کا تصور بھی اُس کے دماغ میں نہیں آتا۔

(۳) اپنے سے کمتر اقوام کی غلامی کر رہا ہے اس لئے اب دنیا میں کوئی قوم اس سے مرعوب نہیں ہے۔

(۴) بظاہر زندہ ہے لیکن وہ صفات جو انسان کو حیوانات سے متمیز کر سکتی ہیں۔ یعنی فکر اور سوچ وچار، اُس میں نظر نہیں آتیں، اس لئے درحقیقت مردہ ہے۔

آخر میں ہاتفِ غیبی مسلمانوں کو اُن کے زوال وانحطاط کے اسباب سے آگاہ کرتا ہے۔ کہ ملوکیت پرستی، ملّا پرستی، اور پیر پرستی نے مسلمانوں کو اسلام کی رُوح سے بیگانہ کر کے دُنیا میں ذلیل وخوار کر دیا۔

اِس نظم میں چند الفاظ بہت غور طلب ہیں۔ اِس لئے نظم کا مطلب لکھنے سے پہلے اُن کی تشریح کئے دیتا ہوں۔

ادراک۔ یہ لفظ ساری نظم کی جان ہے۔ کیونکہ یہی وہ جوہر ہے جس کے ضائع ہو جانے سے انسان، خرس وحمار کی نوع میں شامل ہو جاتا ہے۔

ادراک کا مادہ درک ہے اور درک کے لغوی معنٰی ہیں۔ الوصول الی الشئی یعنی کسی چیز تک پہنچنا۔ یا اُسے حاصل کر لینا۔ یا دریافت کر لینا۔ یا سمجھ لینا۔ دراصل درک میں حصول کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کے اِس قول سے اِس کا لغوی مفہوم بخوبی عیاں ہو سکتا ہے۔

لاتقاتلوا الخوارج بعدی فلیس من طلب الحق فاخطاہ کمن طلب الباطل فادرکہ میرے بعد خوارج سے مت لڑنا جو (گروہ) حق کا طالب ہو لیکن اُسے حاصل نہ کر سکے۔ وہ بہرحال اِس گروہ سے بہتر ہے جو باطل کا طالب ہو اور اسے حاصل کرے۔ یہی مفہوم اِس آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (۶:۱۰۳)

انسانی آنکھیں اُس (خدا) کو دریافت نہیں کر سکتیں یا نہیں پا سکتیں، لیکن وہ (خدا) انسانی آنکھوں کو دریافت کر سکتا ہے۔ یعنی اُن کی حقیقت سمجھ سکتا ہے۔

درک کے لغوی معنی پانا، حاصل کرنا یا دریافت کرنا ہے منطق اصطلاحی معنی پیدا

ہوئے۔ جن کی مختصر تشریح ذیل میں درج کرتا ہوں۔

واضح ہو کہ ادراک کے باب میں حکماء اور متکلمین کا اختلاف ہے (جیسا کہ تمام اصولی باتوں میں ہے)

متکلمین کہتے ہیں کہ ادراک، نفسِ ناطقہ کی صفت ہے جس کی بدولت وہ اشیائے کائنات کا بقدرِ طاقت بشری علم حاصل کرتا ہے۔ بذاتِ خود نفسِ ناطقہ ایک ظلمانی شئے ہے۔ صفتِ ادراک، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اُس کو منوّر کر دیتی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ادراک ایک کیفیتِ نورانی کا نام ہے جس کی بدولت ہم اشیائے کائنات سے اپنے تعلقات کا علم حاصل کرتے ہیں۔

حکماء یا فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ ادراک، صفت نہیں ہے بلکہ عین نفسِ ناطقہ ہے، مجرّد عن المادہ ہے، جوہر ہے، قائم بالذات ہے عین عقل ہے۔

چونکہ اقبالؔ بھی فلسفی ہیں۔ اِس لئے اُنھوں نے حکماء ہی کا مذہب اختیار کیا ہے اور اسی لئے "جوہرِ ادراک" کی ترکیب استعمال کی ہے خلاصۂ کلام یہ ہے۔ کہ ادراک وہ قوت یا جوہر ہے جس کی بدولت اِنسان کو علم حاصل ہوتا ہے۔ اور یہی وہ صفت ہے۔ جو اِنسان کو تمام حیوانات سے متمیز کر دیتی ہے اِس صفت کی اہمیت کا اندازہ اِس بات سے بھی ہو سکتا ہے۔ کہ علم کی طرح اِس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے جیسا کہ آیتِ مذکورہ بالا سے ثابت ہے۔ یعنی کہ اللہ تعالیٰ مُدرِک بھی ہے اور علیم بھی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے مسلمانوں کے زوال کی داستان میں اِس نعمت کے زوال کا ذکر مقدم رکھا ہے۔ کیونکہ اگر یہ جوہر ضائع ہو جائے۔ یا بالفاظِ دگر،

ادراک کھو جائے، تو پھر انسان اپنے مقام سے گر جائے گا۔ اور حیوانات کی نوع میں داخل ہو جائے گا۔

منطق میں ادراک، انکشاف اور مابہ الانکشاف دونوں معنوں میں مستعمل ہے۔ یعنی ادراک یعنی سمجھنا یا علم حاصل کرنا بھی آتا ہے۔ اور اس طاقت کو بھی ادراک کہتے ہیں جس کا ثمرہ یہ انکشاف یا علم ہوتا ہے۔

(۳) افکار جمع ہے فکر کی، اور فکر کو فارسی زبان میں اندیشہ کہتے ہیں، فکر کہتے ہیں۔ تصوّراتِ معلومہ سے مجہولات کے حاصل کرنے کو، اس کی مثال یہ ہے کہ فرض کرو ہمیں یہ معلوم ہے کہ:۔

(A) انسان فانی ہے۔

(B) اور زید انسان ہے۔

تو ہم نے ان معلومات کی مدد سے یہ بات (مجہول) معلوم کر لی کہ زید فانی ہے۔ اس مثال سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ فکر پر ساری منطق کا دارو مدار ہے۔ اسی لئے عرفِ عام میں فلسفی یا منطقی کو مفکر بھی کہہ دیتے ہیں۔ کیونکہ فلسفی یا منطقی اپنے دعاوی کے اثبات کے لئے قیاس، تمثیل اور استقراء سے کام لیتا ہے اور حجت کی ان تینوں قسموں کا دارو مدار فکر پر ہے، فکر منطق میں دو حرکتوں کا نام ہے:۔

(A) پہلی حرکت، مقاصد سے مبادی کی طرف

(B) دوسری حرکت، مبادی سے مقاصد کی طرف۔

مثلاً ہم مکان بنانا چاہتے ہیں۔ تو پہلے ذہن میں نقشہ مرتب کرتے ہیں (مقاصد) پھر اس نقشہ کے مطابق سامانِ تعمیر مہیا کرتے ہیں (مبادی) اب اس کے بعد

دوسری حرکت شروع ہوتی ہے۔ یعنی ہم اس سامان کو حصولِ مقصد کے لئے اصول و ضوابط کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ جب تک انسان اپنی فکر و نظر سے کام لے کسی مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۴) اندیشہ فکر کا مرادف ہے۔ اور اس کے منطقی معنی ہیں سوچنا مبادی تنا سبہ کا، کسی مجہول شے کے حصول کے لئے یعنی فکر و نظر کرنا۔

اندیشہ کے دوسرے معنی تردد، پریشانی یا تحیّر کے بھی آتے ہیں۔

(۵) نگہِ پاک۔ یہ اقبال کی اصطلاح ہے (اگرچہ فلسفۂ تصوف سے ماخوذ ہے) جب ایک مسلمان، عشقِ رسولؐ کی بدولت شانِ فقر پیدا کر لیتا ہے تو وہ تمام کائنات کو شریعتِ محمدیہ کے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مثلاً جب وہ کسی شخص کو شراب پیتے دیکھتا ہے۔ تو وہ اس فعل کو بُرا سمجھتا ہے۔ اور جب وہ کسی شخص کو کسی مظلوم کی مدد کرتے دیکھتا ہے۔ تو اس فعل کو اچھا سمجھتا ہے۔ اس "سمجھ" کو اقبال پاکیزگیٔ نگاہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ مصرعۂ ذیل سے یہ مفہوم واضح ہو سکتا ہے۔

ع فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ

(۶) آئینہ ضمیری۔ یہ بھی اقبال کی اصطلاح ہے اور اس سے مراد ہے مومنانہ زندگی یا شانِ فقر۔ اس کے لغوی معنی ہیں پاکیزگیٔ قلب اور یہ چیز بھی فقر سے پیدا ہو سکتی ہے۔

(۷) سلطانی سے ملوکیت یا ملوکانہ نظام مراد ہے۔ جو قرآنی نظامِ حکومت کی ضد ہے یعنی وہ نظامِ حکومت جس میں انسان، خدا کے بجائے انسان یا چند انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ اسلام کسی انسان کو قانون سازی کا حق نہیں دیتا کیونکہ قانون سازی اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولؐ کا

منصب ہے۔ انسان کا کام صرف یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے قانون کو دنیا میں نافذ کرے۔ صرف ایک آیت اس جگہ درج کرتا ہوں۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵:۴۷) اور جو شخص نہ فیصلہ کرے اس کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی ہیں نافرمان۔

اس آیت کی رُو سے ایک مسلمان کسی ایسے قانون کو تسلیم نہیں کر سکتا جو کسی انسان نے بنایا ہو۔ خواہ اس کا بنانے والا افلاطون ہی کیوں نہ ہو۔

(۸) مُلّائی۔ یہ بھی اقبال کی اصطلاح ہے۔ اور اس سے مُراد ہے مُلّائیت یا مُلّائی نظام۔ لفظ مُلّا دراصل مولیٰ بمعنی آقا سے ماخوذ ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں یہ لفظ اُن علماء کے لئے مخصوص تھا، جو بہت بڑے عالم، فاضل، مصنف اور مدرس ہوتے تھے۔ مثلاً مُلّا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ یا مُلّا محب اللہ بہاری صاحب سُلّم العلوم یا مُلّا جیون امیٹھوی صاحب نور الانوار۔ لیکن رفتہ رفتہ اس طبقہ میں ایسے افراد کی کثرت ہو گئی۔ جن کو علمائے سوء کہتے ہیں یعنی وہ علماء جنہوں نے دین فروشی کو شعارِ زندگی بنا لیا۔ اور عوام کے دلوں میں یہ بات جاگزیں کر دی کہ حق صرف ہمارے پاس ہے جو کچھ ہم کہیں اُس پر آنکھ بند کر کے یقین کرو۔ ہم سے اختلاف کرو گے تو اسلام سے خارج ہو جاؤ گے۔ اس تلقین سے دو نتیجے برآمد ہوئے۔ ایک یہ کہ ایک مُلّا دوسرے مُلّا کا مخالف ہو گیا۔ یعنی باہمی منافرت کا بازار گرم ہو گیا۔ دوسرا یہ کہ عوام ذہنی طور پر مُلّاؤں کے غلام ہو گئے۔ مُلّائیت سے اقبال کی مُراد یہی ذہنی غلامی ہے۔

(۹) پیری۔ یہ بھی اقبال کی اصطلاح ہے اور اس سے مُراد ہے پیر پرستی۔ بزرگانِ

دین، مثلاً شیخ علی ہجویریؒ، خواجہ اجمیریؒ، مخدوم کلیریؒ، یا بوعلی قلندر پانی پتیؒ اپنے مریدوں کو زیورِ علم و عمل سے آراستہ کرتے تھے۔ لیکن اُن کے بعد جب عقابوں کے نشیمن زاغوں کے تصرف میں آ گئے۔ تو ان نقلی پیروں نے اپنے مریدوں کو اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے بجائے اپنی اطاعت کا سبق پڑھانا شروع کیا۔ اس کے بھی دو نتیجے برآمد ہوئے۔ ایک یہ کہ ان پیروں میں حسد کا بازار گرم ہو گیا۔ دوسرا یہ کہ مریدوں میں خدا پرستی کی بجائے پیر پرستی کا رنگ پیدا ہو گیا۔ یعنی عوام ضمیر کی غلامی میں مبتلا ہو گئے۔ پیری سے اقبال کی مراد یہی ضمیر کی غلامی ہے۔

مُلّا نے عوام کو یہ سمجھایا کہ شریعت کا علم صرف ہمارے پاس ہے تم خود کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے شریعت پر عمل کرنا چاہتے ہو تو ہماری اطاعت کرو۔ پیر نے عوام کو یہ بتلایا کہ طریقت کا علم صرف ہمارے پاس ہے۔ تم خود خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے خدا سے ملنا چاہتے ہو تو ہماری اطاعت کرو۔ ان دونوں کی تلقین کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان شخصیت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہو گیا۔ اور شخصیت پرستی، خدا پرستی کی ضد ہے۔ مُلّاؤں اور پیروں کو یہ موقع صرف ملوکیت کی بدولت حاصل ہو سکا۔ کیونکہ بادشاہوں کی "خدائی" موقوف ہے اس بات پر کہ عوام شخصیت پرستی میں مبتلا ہو جائیں۔ اس لئے اُنہوں نے علمائے سوء اور صوفیائے سوء دونوں کی سرپرستی کی۔ خلاصہ اس داستان کا یہ ہے کہ:۔

بادشاہوں نے مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے اپنا غلام بنایا۔

مُلّاؤں نے اس کو ذہنی اعتبار سے اپنا غلام بنایا۔

پیروں نے اس کو روحانی اعتبار سے اپنا غلام بنایا۔

اس سہ گانہ غلامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان خلافتِ الٰہیہ کے مرتبہ سے گر کر حیوانات

کی صف میں شامل ہوگیا۔ اِسی حقیقت کو ایک شاعر نے یوں واضح کیا ہے۔

وَمَا اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْکُ
وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَرُهْبَانُهَا

اور دینِ اسلام کو نہیں تباہ کیا مگر تین طبقوں نے یعنی
(۱) ملوک (۲) علمائے سُوء اور (۳) صوفیوں نے
اِس کی تشریح کے بعد اب میں نظم کا مطلب لکھتا ہوں۔

(۱) اے مسلمان! کبھی تو نے اِس بات پر غور کیا کہ ہر روز صبح کے وقت عرشِ بریں سے آواز آتی ہے۔ یعنی خدا تجھ سے دریافت کرتا ہے کہ اے مسلمان! تو جوہرِ ادراک سے کیوں محروم ہوگیا؟ یعنی کیا تو نے کبھی اِن اسباب پر غور کیا، جن کی بدولت تو علم کی نعمت اور اس کی لذّت سے بیگانہ ہوگیا؟ تجھ میں علم حاصل کرنے کی تڑپ کیوں مفقود ہوگئی؟ تیرا وہ علمی ذوق کہاں چلا گیا؟

نوٹ:۔ مسلمانوں کی علم سے بیگانگی کا اندازہ اِس بات سے بھی ہوسکتا ہے۔ کہ ہندوستان میں صرف ایک سال یعنی ۱۹۴۳ء میں ہندوؤں نے فلسفہ پر ۳ ۲ کتابیں لکھ کر شائع کیں۔ لیکن مُسلمانوں نے گذشتہ نصف صدی میں صرف ایک علمی کتاب شائع کی جس کا نام ہے۔ "اِسلام میں مذہبی فکر کی تشکیلِ جدید" اور اس کا مصنّف یہ داغ اپنے دل پر لے گیا کہ مسلمانوں نے اِس کے پڑھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ اِس کتاب کی اشاعت کو ۲۲ سال ہوگئے۔ لیکن نہ ابھی تک۔ اِس کا اُردو یا فارسی میں ترجمہ ہوا ہے اور نہ اِس کی کوئی شرح لکھی گئی ہے۔

(۲) اے مسلمان! کیا بات ہے کہ تو اب نہ تحقیق (ریسرچ) اور انکشافات کی طرف

مائل ہوتا ہے۔ نہ کوئی شئے ایجاد کرتا ہے نہ کوئی نئی بات دریافت کرتا ہے۔ نہ دُنیا کے سامنے کوئی علمی نظریہ پیش کرتا ہے۔ نہ کوئی آلہ یا مشین بناتا ہے۔ گذشتہ تین سو سال میں دُنیا نے جس قدر ترقی کی ہے۔ اِس میں تیرا کوئی حصّہ نہیں ہے۔ کیا تُو نے اِس بات پر غور کیا ہے۔ کہ اِس کی وجہ کیا ہے؟ آخر یہ بات کیا ہے۔ کہ تو اپنے مُلک کی قدرتی پیداوار سے استفادہ کے لئے بھی غیروں کا محتاج ہے؟ تو اپنے تیل کے چشموں سے خود تیل کیوں نہیں نکالتا؟ تو خود کیوں نہیں معلوم کرتا۔ کہ تیرے مُلک میں کونسی معدنی اشیاء زیرِ زمین پوشیدہ ہیں۔ اور تُو اب ستاروں کے جگر کیوں نہیں چاک کرتا۔ یعنی طبیعات اور کیمیا اور دیگر سائنٹفک علوم میں دادِ تحقیق کیوں نہیں دیتا؟ مثلاً تو ایٹم بم کیوں نہیں بناتا؟ یہ تو بڑی چیز ہے تو ہوائی جہاز کیوں نہیں بناتا؟

(۳) اے مسلمان! ہم نے تجھے ظاہری (مادی) اور باطنی (رُوحانی) دونو طاقتیں عطا کیں تھیں، دُنیا اور دین دونوں میں سروری کی اہلیت عطا کی تھی۔ ہم نے تجھے ساری کائنات پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ تو ساری کائنات کا غلام بنا ہوا ہے؟ ہم نے تجھے دُنیا میں شعلہ بنا کر بھیجا تھا۔ تاکہ تو کفر کے خس و خاشاک کو پھونک کر رکھدے۔ لیکن سخت حیرانی کی بات ہے کہ آج وہی، شعلہ یورپ اور امریکہ کے خس و خاشاک پھونک دینے کے بجائے اِن دونوں کے سامنے سجدہ ریز ہے!

(۴) اے مُسلمان! کیا بات ہے کہ اب عناصرِ کائنات تیرے محکوم نہیں رہیں؟ اب تجھے اِن پر کوئی قدرت حاصل نہیں ہے؟ اور کوئی قوم تجھ سے مرعوب نہیں ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا۔ جب قیصر اور کسریٰ تیرے نام سے کانپتے تھے۔ لیکن آج مٹھی بھر یہودیوں نے تیری عزّت خاک میں ملا دی۔ چنانچہ ہزاروں دختران توحید اُن کے قبضہ میں ہیں۔ مگر تُو

آنکھیں واپس نہیں لے سکتا۔ آخر اِس بیچارگی کا کیا سبب ہے؟ تو اِس قدر بے غیرت بے حیا بے کس اور بیچارہ کیسے ہوگیا؟

(۵) یہ سچ ہے کہ تو زندہ ہے، یعنی کھاتا پیتا ہے۔ نکاح کرتا ہے۔ دُنیا کی آبادی یا غلاموں کی تعداد میں اضافہ کرتا ہے۔ لیکن تیری زندگی اب حیوانات کی سطح سے اونچی نہیں ہے۔ یعنی نہ تجھ میں غور و فکر کا مادّہ ہے۔ نہ تیرے اندر اخلاقی جرأت ہے۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے اِس مصرع میں "گرمیٔ افکار" اور "اندیشۂ بیباک" کی ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ اوّل الذکر سے مُراد یہ ہے کہ غور و فکر کی بدولت اِنسان کے اندر عمل کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ فکر سے گرمی پیدا ہوتی ہے "گرمی" سے مُراد ولولہ یا جوش ہے جو انسان کو جدوجہد پر راغب کر دیتا ہے۔

"اندیشۂ بیباک" یہ بھی اقبالؔ کی اصطلاح ہے اور اِس سے مراد ہے اخلاقی جرأت یعنی مسلمان جس بات کو حق سمجھے اُسے بلا پس و پیش ظاہر کر دے۔ اور اِس حق گوئی کے سلسلہ میں کسی طاقت سے مرعوب نہ ہو۔ اِسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنا افضل الجہاد ہے۔ میرے دل میں حضرت امام احمد حنبل رح اور حضرت امام ربّانی مجدد الفِ ثانیؒ کی جو عزّت ہے وہ اِسی لئے کہ اِن بزرگوں نے اپنے زمانے کے ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہا اور اس کی پاداش میں قید و بند کی سختی اور ذلّت کو خوشی برداشت کیا۔ آج نہ ماموں کو کوئی جانتا ہے نہ جہانگیر کو کوئی پہچانتا ہے۔ لیکن اِن دونوں اماموں کا نام آج بھی زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا۔ اور مسلمانوں کے قلوب میں عزّت اور احترام کے جذبات پیدا کرتا رہے گا۔

(۶) اِن آخری دو شعروں میں بالفاظِ یعنی مسلمانوں کو اُن کے زوال کے اسباب سے

آگاہ کرتا ہے، چنانچہ کہتا ہے کہ اے مسلمان! یاد رکھ بلکہ اِس حقیقتِ کُبریٰ کو لوحِ دل پر نقش کر لے کہ جس شخص میں شانِ فقر نہیں ہوتی وہ شخص کبھی اپنی اور اِس دُنیا کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ وہ شخص دُنیا اور دُنیا والوں کو تو بیشک اچھی طرح دیکھ سکتا ہے مثلاً زید کے پاس پچاس لاکھ رُوپے نقد موجود ہیں، خالد کے پاس دس ہزار ایکڑ زمین ہے، غلام علی کے پاس سینکڑوں موٹریں ہیں اور خادم حسین کے پاس ہزاروں بلڈنگیں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ لیکن وہ شخص اِس حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا کہ روپیہ اور موٹریں اور زمین یہ چیزیں، عارضی ہیں، فانی ہیں اور فریبِ نظر ہیں۔ بلکہ یہ دُنیا کی زندگی ہی بذاتِ خود سراسر دھوکہ کی ٹٹی ہے۔

وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (۵۷ - ۲۰)

اے مسلمانو آگاہ ہو جاؤ کہ، دُنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر دھوکہ کی پونجی۔

(۷) اے مسلمان! تیرے زوال و انحطاط بلکہ تمام مصائب کا اصلی سبب یہ ہے کہ تجھ میں شانِ فقر (آئینہ ضمیری) باقی نہیں رہی اور اِس شانِ فقر کے فقدان کا باعث یہ ہے کہ تو ملوکیت، مُلّائیت اور پیر پرستی اِن تین لعنتوں میں گرفتار ہوگیا یا تُو نے خدا پرستی کے بجائے ملوک پرستی، مُلّا پرستی اور پیر پرستی اختیار کر لی۔ واضح ہو کہ اِن سہ گانہ لعنتوں کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مُسلمان، مُسلمان کی حیثیت سے فنا ہو جاتا ہے۔ یعنی اِسلامی (قرآنی) زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ بالفاظِ دگر عملی اعتبار سے کافر ہو جاتا ہے اگرچہ زبان سے اِسلام کا دعویٰ مرتے دم تک کرتا رہتا ہے۔ اہلِ علم اور اربابِ بینش اِسی طرزِ عمل کو منافقت کہتے ہیں۔ جو میری رائے میں کُفر سے بھی بدتر ہے ۱۲

تبصرہ

واضح ہو کہ اقبالؔ نے اِس نظم میں زوالِ ملّتِ اسلامیہ کے اسباب پر اپنی تمام عمر کی غور و فکر کا نچوڑ پیش کر دیا ہے، یعنی مسلمانوں کے سیاسی علمی اخلاقی اور تمدنی غرضکہ بحیثیت قوم اُن کے زوال بلکہ فنا کے اسباب تین ہیں۔

(۱) اِن میں خلافت کے بجائے ملوکیت رائج ہو گئی۔

(۲) مُلّاؤں نے اِن میں تقلید کورانہ (جامد) کا مرض پیدا کر دیا یعنی عوام اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ دین کا علم صرف ایک خاص طبقہ سے مخصوص ہے۔ اِس لئے جو وہ کہے اس پر آنکھ بند کر کے ایمان لے آؤ۔

واضح ہو کہ اقبالؔ کے یہاں مُلّائیت کے دو معنی ہیں۔

(۱) مُلّا کی یہ ذہنیت کہ جو میں کہوں، وہی حق ہے، اِس لئے سب کو میری تقلید کرنی چاہیئے۔

(۲) عوام کی یہ ذہنیت کہ مُلّا سے اختلاف رائے کرنا گویا اسلام سے بغاوت کرنا ہے۔ یا اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت کرنا ہے۔

(۳) پیروں نے اِن میں اِنسان پرستی کا رنگ پیدا کر دیا۔ یعنی عوام اِس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ طریقت یا معرفت کا علم صرف ایک خاص طبقہ سے مخصوص ہے لہٰذا اس کی ہر بات پر بلا چون و چرا ایمان لے آؤ۔

مُلّا اور پیر دونوں کی تلقین کا نتیجہ ایک ہی نکلا یعنی کورانہ تقلید اور شخصیت پرستی مسلمانوں کے دل و دماغ میں روح گئی اور تاریخ گواہ ہے کہ ایسی بُری طرح رچی ہے کہ اب کسی اِنسان کے نکالے نہیں نکل سکتی۔

پنجاب اور سندھ کے مرید اپنی آنکھوں سے اپنے، پیروں کی کرامات دیکھتے ہیں لیکن ان کی عقیدت میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض حضرات کی عقیدت میں تو اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

واضح ہو کہ اقبالؔ نے اِن تین اسباب میں دراصل مسلمانوں کی سیزدہ صد سالہ تاریخ کا خلاصہ بیان کر دیا ہے، اِس لئے جب تک مسلمانوں کی پوری قومی تاریخ پیش نظر نہ ہو اقبالؔ کا یہ دعویٰ مبرہن نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں اِس شرح میں ۱۴۰۰ سال کی تاریخ لکھنی چاہوں تو بھی نہیں لکھ سکتا صرف چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔

پہلی بات یہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنے کلام میں مُلّائیت کی ضرور تردید کی ہے لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مُلّاؤں سے ناراض تھے۔ واضح ہو کہ مُلّا اور مُلّائیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اقبالؔ، مُلّائیت سے بیشک بیزار تھے۔ لیکن مُلّا یعنی عالمِ دین کے تو عاشقِ زار تھے۔ چنانچہ آخر عمر میں اُنھوں نے بڑی کوشش کی کہ ہندوستان کا سب سے بڑا مُلّا (یعنی امام العصر علامۃ الدہر حضرت مولانا مولوی انور شاہ صاحب کشمیری مرحوم (مغفور) کسی طرح لاہور میں مستقل طور سے اقامت گزیں ہو جائیں۔ تاکہ وہ اُس سے استفادہ کر سکیں۔ لیکن افسوس کہ مُلّائیت کے ایک نامور علمبردار نے اپنی چابکدستی سے اقبالؔ کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ کیونکہ اس مُلّا کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ کہ اگر شاہ صاحب قبلہ نے لاہور میں مستقل سکونت اختیار فرمالی تو اس کا چراغ گل ہو جائے گا۔

دوسری بات یہ ہے اِسلام میں خلافت کا دور صرف ۳۰ سال تک رہا۔

سنہ ۴۱ھ میں خلافت کی جگہ ملوکیت قائم ہو گئی یعنی حکمرانی نظام کی حیثیت سے اسلام ہمیشہ کے لئے فنا ہو گیا۔ ہاں مذہب کی حیثیت سے ضرور باقی رہ گیا ہے یعنی رُوح تو سنہ ۴۱ھ میں نکل گئی لیکن لاشہ بیجان ابھی تک موجود ہے، جسے بعض مسلمان ممالک نے سینہ سے لگا رکھا ہے۔ اور بعض ممالک سینہ سے لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جب بنو امیہ نے دینِ اسلام (خدائی حکومت) کو ختم کیا تو مسلمانوں میں خدا پرستی کے بجائے اِنسان پرستی کا دور شروع ہو گیا۔ اور سب جانتے ہیں کہ آخر الذکر، اوّل الذکر کی ضد ہے اور دو ضدیں کبھی ایک ظرف میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ ایک اِنسان پرست، کبھی ہرگز خدا پرست نہیں ہو سکتا۔ ملوکیت سے اِنسان پرستی کیسے پیدا ہوتی ہے اِس کو صرف ایک نظیر سے سمجھ سکتے ہیں۔

جب فاروقِ اعظمؓ خلیفہ ہوئے تو اُنھوں نے منبرِ رسول اللہ صلعم پر چڑھ کر یہ اعلان فرمایا کہ جو مسلمان میرے اندر کوئی کجی (عیب) دیکھے تو مجھ کو سیدھا کر دے۔ لیکن جب عبد الملک بن مروان بادشاہ ہوا تو اُس نے منبر پر چڑھ کر یہ "سیفٹی ایکٹ" نافذ کیا کہ آج کی تاریخ سے جو مسلمان مجھ سے یہ کہے گا کہ خدا سے ڈرو تو میں اُسے قتل کر دوں گا۔

اِس تنبیہ کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ بنو امیہ اور بنو عباس کی مسلسل کوششوں سے دُنیائے اسلام میں کوئی ایسا شخص باقی نہ رہا جو کسی بادشاہ سے یہ "غیر اسلامی" فقرہ کہہ سکتا۔

ابتدا میں ایک جماعت مسلمانوں میں ضرور پیدا ہو گئی تھی جس نے اسلام کو دین کی حیثیت سے زندہ کرنے کی کوشش کی چنانچہ اُس نے "إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ" کا نعرہ

بلند کیا اور ایمان کی پوری طاقت کے ساتھ میدان میں آ گئی۔ بنو امیہ کا مشہور سپہ سالار مُہلب ابن ابی صفرہ مقابلہ پر آیا۔ لیکن پوری سلطنت کی پُشت پناہی کے باوجود ان دیوانوں کو شکست نہ دے سکا۔

مگر بدقسمتی سے خود اِس مٹھی بھر جماعت میں افتراق پیدا ہو گیا۔ اور اسی وجہ سے انجام کار سرفروشوں کی اس جماعت کا خاتمہ ہو گیا ہارون الرشید عباسی کے کارناموں میں سب سے زیادہ شاندار کارنامہ یہی ہے کہ اُس نے اِس جماعت کے آخری نام لیواؤں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جو یہ کہتی تھی کہ حکومت صرف اللہ کا حق ہے اِس لئے مہدی کے فرزند کو مسلمانوں پر حکمرانی کا کوئی حق نہیں ہے یہ مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ جس کو چاہیں خلیفہ یا امیر منتخب کر لیں۔

دیکھا آپ نے ملوکیت کی اِس کرشمہ سازی کو ہارون اور اس کے پیشروؤں نے حکومتِ الٰہیہ کے داعیوں کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا لیکن کسی مُلّا یا پیر نے عبد الملک اموی یا ہارون عباسی سے یہ نہیں کہا کہ جناب! وہ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ اِسلام میں حکومت باپ سے بیٹے کو ورثہ میں نہیں مل سکتی۔ (اگر ایسا ہوتا تو فاروقِ اعظم اپنے بیٹے حضرت عبد اللہ ابن عمر کو نامزد فرما جاتے۔ اس لئے آپ تخت و تاج سے دستبردار ہو جائیں اور مسلمانوں کو قرآنی تعلیمات کے مطابق اپنا امیر خود منتخب کرنے کا موقع دیں اِسی لئے اقبالؔ مُلّا اور پیر دونوں کو ملوکیت کا معاون سمجھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے دورِ حکومت میں بعض علماء نے ملوکیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی لیکن بادشاہوں نے طاقت کے زور سے اِن حق پرستوں کو اسی طرح ختم کر دیا۔ جس طرح انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے حق پرست علماء کو ختم کر دیا۔

میری رائے یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان، مسلمانوں کے زوال کا باعث صرف ملوکیت ہے جو سنہ ۴۱ھ میں رائج ہو گئی اور مختلف عناصر اور متعدد عوامل کی بدولت مسلمانوں کی زندگی کا مدار غلبہ بن گئی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مُلّا پرستی اور پیر پرستی سے ملوکیت کو مزید تقویت حاصل ہو گئی۔ اور مسلمان سیاسی غلامی کے علاوہ ذہنی اور روحانی غلامی میں بھی مبتلا ہو گئے۔ یعنی "کَالْاَنْعَام" کا مصداق بن گئے۔

اب رہی اسباب کی وضاحت کہ مُلّاؤں اور پیروں کی تقلید سے ذہنی اور روحانی غلامی کیسے پیدا ہوئی تو یہ داستان اس قدر تلخ ہے کہ مجھے یقین ہے کہ ناظرین اس کو برداشت نہ کر سکیں گے۔ اس لئے مصلحتاً قلم روکتا ہوں۔

رباعیات

۱

مری شاخِ امل کا ہے ثمر کیا
تری تقدیر کی مجھ کو خبر کیا
کلی گُل کی ہے محتاجِ کشود آج
نسیمِ صبحِ فردا پر نظر کیا!

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ نہ تو مجھے یہ معلوم ہے کہ میری اُمید کے درخت پر کس قسم کا پھل لگے گا۔ یعنی میری اُمید پوری ہو گی یا نہیں؟ اور نہ یہ معلوم ہے کہ تیری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ میں یا کوئی اور شخص آئندہ واقعات سے آگاہ

نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جو کلیاں آج شگفتہ ہو کر پھول بننا چاہتی ہیں وہ صبحِ فردا کی نسیم کا انتظار نہیں کر سکتیں۔ اسی طرح اے مُسلمان! تیری قوم (کلی) اس وقت مشکلات میں محصور ہے۔ اس لئے اس کے حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہر فرد فی الفور اپنی اپنی جگہ قومی فلاح و بہبود کے لئے کوشش شروع کر دے۔ اس توقع پر، عمل سے غافل نہ ہو جائے کہ آئندہ کسی زمانے میں جب خدا کی مہربانی (نسیمِ صبح) شاملِ حال ہو جائے گی تو سب بگڑے ہوئے کام سنور جائیں گے۔ یعنی تائیدِ غیبی کی اُمید میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔

تبصرہ

اس رباعی میں اقبال نے اپنا بنیادی فلسفہ پیش کیا ہے یعنی قوم کو عمل کا پیغام دیا ہے۔ مسلمانوں میں اس وقت دو تصورات کارفرما ہیں:۔

(۱) اُن کے دماغ میں تقدیر کا غلط مفہوم جاگزیں ہو گیا ہے۔ یعنی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ قبل تخلیقِ عالم معیّن اور مقدر ہو چکا ہے۔ اس لئے ہم جدوجہد، عمل اور کوشش کریں یا نہ کریں جو ہونے والا ہے وہ لامحالہ واقع ہو گا۔ اگر ہمارے لئے کامیابی مقدر ہے تو خدا خود ایسے اسباب پیدا کر دے گا کہ ہمیں کامیابی حاصل ہو جائیگی۔ اس لئے ہمیں جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے۔

اقبال نے ساری عمر اس غلط عقیدہ کی تردید کی چنانچہ اُن کی تصانیف کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے شائقین کو لازم ہے کہ وہ اِن کے کلام کا مطالعہ کر کے اِن کے فلسفہ سے آگاہی حاصل کر لیں۔ یہاں میں صرف اس قدر لکھتا ہوں کہ

مسلمانوں میں یہ غلط تصور، قرآنِ حکیم اور سیرتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے بیگانگی کی بدولت پیدا ہوا ہے۔ اگر واقعی قرآنِ حکیم کی یہی تعلیم ہوتی کہ جو ہونے والا ہے وہ خود بخود واقع ہو جائے گا۔ ہمیں کسی قسم کی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے یا اگر ہماری تقدیر میں شکست لکھی ہے تو ہماری کوشش بالکل بیکار ہے وغیرہ وغیرہ، تو نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کئی روز تک غارِ ثور میں پوشیدہ رہتے۔ اور نہ مدینہ کے گرد خندق کھودنے میں شرکت فرماتے۔ حضورِ اقدس صلعم کی زندگی، تقدیر کے اس غلط مفہوم کی مکمل طور پر تردید کرتی ہے۔ آپ سے بڑھ کر تائیدِ ایزدی کا کس کو یقین ہو سکتا تھا اور آپ سے بڑھ کر فضلِ ربی کا اُمیدوار کون ہو سکتا تھا؟ لیکن آپ نے ہمیشہ ہر معاملے میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مناسبِ حال ذرائع اور وسائل مہیا فرمائے۔ اگر تقدیر کا وہی مفہوم ہوتا جو ہمارے دماغوں میں جاگزیں ہو گیا ہے تو ہجرت کی رات آپ اپنی جان کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ فرماتے بلکہ حضرت صدیقِ اکبرؓ سے یہ فرماتے کہ تم کوئی تدبیر اختیار نہ کرو، اگر ہماری تقدیر میں دشمنوں کے نرغے سے بچ کر بخیر و عافیت یثرب تک پہنچ جانا لکھا ہے اور اگر اسلام کی کامیابی مقدر ہو چکی ہے تو پھر ہم کو کسی قسم کی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے خدا، خود ہی سب کام کر دے گا۔

لیکن اس کے برعکس تاریخ کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے ہجرت سے کئی ماہ پہلے اس کے لئے تیاریاں شروع فرما دی تھیں۔ اور اکثر اپنے محرمِ راز اور عاشقِ صادقؓ سے راتوں کی تنہائی میں مشورہ فرماتے تھے۔

اسی طرح آپ ہر غزوہ کے لئے مناسب تیاری فرماتے تھے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ، رتن بہ تقدیر، بغیر ساز و سامان، مقابلہ کے لئے تشریف لے گئے ہوں۔

چنانچہ جب آپ نے دشمن کے مقابلہ پر تبوک تشریف لے جانے کا فیصلہ فرمایا تو سب سے پہلے، سامانِ جنگ کی فراہمی پر توجہ مبذول فرمائی۔ اقبال نے اس شعر میں اسی تیاری کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

اِک دن رسولِ پاکؐ نے اصحابؓ سے کہا
دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مال دار

حضرت عثمان ذُوالنورینؓ نے اسی غزوہ کے لئے ایک ہزار اونٹ مع ساز و سامان اور سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار سرخ حضورؐ کی خدمت میں پیش کئے تھے، جس کے صلہ میں بارگاہِ رسالت سے اِن کو خوشنودی کا پروانہ عطا ہوا تھا۔ یعنی جب حضورؐ نے ان کا یہ ایثار ملاحظہ فرمایا تو دونوں ہاتھ اُٹھا کر اُن کے حق میں دُعا فرمائی۔ (اَللّٰھُمَّ اَرْضِ عَنْ عُثْمَانَ، وَاِنِّیْ عَنْہُ رَاضٍ۔ یعنی اے اللہ! تو بھی عثمان سے راضی ہو جا (کیونکہ) میں اُس سے راضی ہو گیا ہوں۔ خوش نصیب اُس عاشق کے جس کا معشوق اُس سے راضی ہو جائے۔!

(۲) دوسرا غلط عقیدہ مسلمانوں میں یہ راسخ ہو گیا ہے کہ عنقریب حضرت عیسیٰؑ اور امام مہدیؑ ظاہر ہوں گے اور ہمارے دشمنوں کا قلع قمع کر دینگے۔ اس لئے ہمیں بطورِ خود کسی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے صرف اِن بزرگوں کا انتظار کرنا ہی کافی ہے۔

اقبال نے اس رباعی میں، انہی دونوں غلط خیالات کی تردید کی ہے وہ کہتے ہیں کہ تقدیرِ الٰہی برحق ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہے کہ مسلمان عمل سے فارغ ہو جائیں چنانچہ دوسری جگہ وہ خود کہتے ہیں:۔

عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

بیشک جو خدا چاہے گا وہی ہوگا۔ لیکن یہ بھی تو خدا ہی نے فرمایا ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ یعنی انسان کو وہی ملے گا جس کے حصول کے لئے وہ کوشش کرے گا۔ اس لئے ہمیں اس کے قانون کی اطاعت کرنی لازمی ہے۔ جس خدا کے ہاتھ میں انسان کی تقدیر ہے اُسی خدا نے انسان کو جدوجہد کا حکم دیا ہے۔ اس لئے انسان (مسلمان) کا فرض ہے کہ جب تک زندہ رہے، جدوجہد کرتا رہے، تقدیر یا مشیت ایزدی کے کرشموں کا منتظر نہ رہے۔ قرآن حکیم میں کسی جگہ یہ نہیں لکھا ہے کہ اے بندو! چونکہ جو کچھ ہم نے تمہاری تقدیر میں لکھ دیا ہے وہ یقیناً ظاہر ہوگا۔ اس لئے تمہیں کسی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ہر جگہ عمل صالح اور جدوجہد (جہاد) کی تاکید فرمائی ہے چنانچہ سرکار دوعالم صلعم کی ۲۳ سالہ زندگی اِسی صداقت پر شاہد ہے۔

اِسی طرح اقبال کہتے ہیں بیشک حضرت عیسٰیؑ بھی آئیں گے اور امام مہدی بھی خروج فرمائیں گے۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ مسلمان اُن کی آمد کے انتظار میں عمل سے بیگانہ ہو جائیں اور حجروں میں بیٹھے ہوئے ان بزرگوں کے ظہور کی دُعا کرتے رہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوگی تو ان بزرگوں کا ظہور ہو جائے گا۔ لیکن ان کے انتظار میں جدوجہد سے غافل یا بیگانہ ہو جانا، یہ سراسر خلاف تعلیمات قرآن ہے۔

فرض کرو کہ ایک مریض تو اس وقت دوا کا محتاج ہے لیکن آپ اُس سے یہ کہیں کہ جب بقراط یا جالینوس کا مثیل پیدا ہوگا اُس وقت تمہارا علاج کرایا جائے گا تو خود ہی انصاف کیجئے اس مریض کو اپنی صحت یابی کی کیا اُمید ہو سکتی ہے۔ اسی طرح اقبال

کہتے ہیں کہ جب حضرت عیسٰیؑ و مہدی ظاہر ہوں گے اس وقت وہ تمہاری مشکلات حل کریں گے تو کیا یہ وہی بات نہ ہوگی کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود، مارگزیدہ مردہ شود۔

نوٹ:- میں نے اِس رُباعی کی تشریح میں غیر معمولی وضاحت سے کام لیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اقبال مرحوم کے فلسفہ کی رُوح پوشیدہ ہے۔ اُنھوں نے ساری عمر (از ۱۹۰۸ء تا ۱۹۳۸ء) مسلمانوں سے ایک ہی بات کہی اور وہ یہ کہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اور یہ بات اُنھوں نے قرآن حکیم سے اخذ کی تھی جو اوّل سے آخر تک عمل صالح (جہاد فی سبیل اللہ) کی تلقین کرتا ہے چونکہ مسلمان اِسی بنیادی تعلیم سے برگشتہ، بیگانہ، غافل اور نفور ہو گیا ہے اِس لئے اقبال نے ساری عمر اسے اس کا فراموش کردہ سبق یاد دلایا اور اسی لئے میں نے بھی اِس رُباعی کی تشریح میں غیر معمولی وضاحت سے کام لیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ میں خود اپنے ۴۲ سالہ تجربہ کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ عقیدۂ تقدیر اور نزولِ مسیح و مہدی کے غلط مفہوم نے مسلمانوں کی قوتِ عمل کو بالکل ختم کر دیا ہے یعنی وہ رُوح مُردہ ہو گئی جس کی بدولت اُن میں عمل کا جذبہ پیدا ہو سکتا تھا۔

جب کبھی مسلمانوں پر مصائب کا ہجوم نزول ہوا تو اُنھوں نے اجتماعی جدوجہد کے بجائے زیادہ شدت کے ساتھ مسیح موعود کے نزول کا انتظار شروع کر دیا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ۱۹۱۸-۱۹ء میں دُنیائے اسلام پر چاروں طرف سے مصائب کا

نزول ہو رہا تھا تو مسلمان بڑے اشتیاق کے ساتھ حضرت عیسٰی کے نزول کے منتظر تھے۔ چنانچہ اُن کے نزول کا متوقع سال متعین کر دیا گیا تھا یعنی ۱۳۴۰ھ جس طرح آج کل مسلمانوں کی گفتگو کا موضوع کشمیر ہے اُسی طرح ۱۹۲۰ء میں جہاں کہیں چار لکھے پڑھے مسلمان جمع ہو جاتے تھے تو نزولِ مسیح اور ظہور مہدی ہی ان کی گفتگو کا موضوع ہوتا تھا۔ چنانچہ اُسی زمانہ میں بجنور کے مشہور اخبار مدینہ میں ایک نظم شائع ہوئی تھی۔ جس کے ایک شعر سے قوم کے رجحانِ طبع کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے:-

حضرتِ عیسٰیؑ نہ آئے اب تو پھر آئیں گے کب
قوم کی کشتی کو طوفاں سے بچانے کے لئے

اس شعر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اُس زمانہ میں قوم کس شدت کے ساتھ نزول مسیح کی منتظر تھی۔ میں نے اپنے کانوں سے مسلمانوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ جب حضرت عیسٰیؑ آئیں گے، تو وہ ہمارے سارے دشمنوں کا قلع قمع کر دیں گے۔ اس لئے ہمیں موجودہ مصائب کو صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لینا چاہیے۔

نزولِ مسیحؑ و ظہورِ مہدیؑ کا عقیدہ سر آنکھوں پر لیکن جو نتیجہ اس نزول و ظہور سے میری قوم نے مرتب کیا یا جو اثر اس عقیدہ سے میری قوم نے قبول کیا وہ بلا شبہ نہایت مضرت رساں بلکہ تباہ کن ثابت ہوا یعنی پُوری قوم عمل کے جذبہ سے محروم ہو گئی۔

اقبال یہ کہتے ہیں کہ یہ کہاں لکھا ہے کہ چونکہ حضرت عیسٰیؑ اور حضرت مہدیؑ نازل ہو کر اسلام کو ساری دُنیا پر غالب کر دیں گے۔ اس لئے مسلمانوں کو عمل یا جدوجہد سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے یا اُس وقت تک مسلمانوں کو کسی جدوجہد کی ضرورت نہیں۔

فراغت دے اسے کارِ جہاں سے
کہ چھوٹے ہر نفس کے امتحاں سے
ہوا پیری سے شیطاں کہنہ اندیش
گناہِ تازہ تر لائے کہاں سے!

مطلب:- اِس رُباعی میں اقبال نے بظاہر خدا سے شیطان کی سفارش کی ہے کہ مولا کریم! اگر تیری مرضی ہو تو اب اِس بیچارہ پر رحم کر اور اُسے اہلِ جہاں کو ورغلانے کے کام سے فارغ کر دے۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا کیونکہ اگر وہ ایسا کرے تو اپنی اصل یا حقیقت سے دُور ہو جائے۔ اِس کا فرض ہے کہ ہر لمحہ بنی آدم کے قلوب میں وساوس پیدا کرتا رہے یعنی ہر وقت اپنی شیطنت کا ثبوت دیتا رہے۔

اے خدا یہ ایک حقیقت ہے کہ شیطان بوڑھا ہو چکا ہے (اقل تخمینہ کے مطابق اس کی عمر سات ہزار سال سے کم نہیں ہے) اِس لئے اس کے تصورات و تخیلات بھی فرسودہ ہو چکے ہیں کہ اب ان میں کوئی جدت باقی نہیں رہی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب وہ ہم سے نئے گناہوں کا ارتکاب نہیں کرا سکتا تو اے خدا ہم لوگ اب لوٹ کر پھر وہی پرانے گناہ کر رہے ہیں چونکہ اب وہ نئے گناہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اِس لئے مناسب ہے کہ تو اُسے اِس "ڈیوٹی" (کارِ جہاں) سے فارغ کر دے۔ یعنی اب خیر و شر کا ناٹک ختم کر دے۔ جب ہم کوئی نیا گناہ نہیں کر رہے ہیں (کیونکہ ان کا سارا اِسٹاک ختم ہو چکا ہے) تو اب انہی پرانے گناہوں کی تکرار سے کیا حاصل؟

تبصرہ

واضح ہو کہ اقبالؔ فلسفی ہونے کے علاوہ شاعر بھی تو ہیں۔ بلکہ شاعر پہلے ہیں فلسفی بعد میں ہیں اس لئے کبھی کبھی وہ محض شاعر کی حیثیت سے بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ یعنی شاعر وہ ہے جو انسانی فطرت کی عکاسی کرے اور جو کیفیت یا جذبہ اس کے دل پر طاری ہو اُسے بے کم و کاست بیان کر دے۔ یہی خالص شاعر اور فلسفی یا پیغام گو شاعر یا مصلح شاعر میں بنیادی اور اصولی فرق ہوتا ہے۔ فلسفی شاعر اپنے جذبات کو بے کم و کاست بیان کر دیتا ہے وہ اس وقت یہ ہرگز نہیں سوچتا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ میرے فلسفہ یا عقیدہ یا پیغام یا سوسائٹی کے قوانین کے خلاف تو نہیں ہے اس وقت تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جو محسوس کرتا ہے وہ بلا خوف لومۃ لائم، واشگاف بیان کر دیتا ہے۔

اقبالؔ ایک فلسفی اور پیغام گو ہی لیکن بہرحال وہ شاعر ہیں اس لئے اُن کے یہاں اس قسم کے اشعار بھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں جن میں اُنھوں نے واردات قلبی کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔

مثلاً جب انسان پر چاروں طرف سے مصائب کا نزول ہوتا ہے تو وہ بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے کہ

ع یہ زندگی ہے سراپا رحیل بے مقصود

حالانکہ وہ بخوبی جانتا ہے کہ زندگی اگر واقعی بے مقصود ہے تو پھر خدا کا وجود ثابت نہیں ہو سکتا اور جب خدا نہیں تو نہ رسول باقی رہا نہ کتاب سلامت رہی نہ دین کا ٹھکانہ رہا نہ ایمان کا۔

یہ رُباعی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے یعنی اقبال نے شاعرانہ شوخی سے کام لے کر، انسان کی ایک ایسی مخفی آرزو کا اظہار کر دیا ہے جس سے کوئی دانشمند انکار نہیں کر سکتا۔ اور وہ یہ ہے کہ کیا اچھا ہو اگر خیر و شر کا یہ تنازع کسی طرح ختم ہو جائے۔

ضمناً اقبالؔ نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ لَا یُوجَدُ جَدِیْدٌ تَحْتَ الشَّمْسِ، یعنی دُنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے۔ مثلاً

(۸) وہ تمام نظریات جو کانٹ، ہیگل، ڈارون، نیٹشے اور برگساں نے موجودہ زمانہ میں پیش کئے ہیں، یہ سب نظریات قدیم فلاسفر اپنے اپنے عہد میں، مختلف لفظوں میں پیش کر چکے ہیں۔

(ب) جو مضامین جدید شعراء اپنے کلام میں پیش کر رہے ہیں، شعرائے متقدمین اُن سب کو اس سے بہت پہلے پیش کر چکے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ شراب تو وہی ہے صرف بوتل کا سائز اور لیبل کا رنگ بدل گیا ہے۔

(ج) اگر اس زمانہ کی عورتیں حُسن کے مقابلہ میں شرکت کرتی ہیں تو نمائشِ حُسن یعنی تبرّج کا جذبہ تھیوڈورا اور کلوپٹرا کے عہد میں بھی اس شدت کے ساتھ کارفرما تھا۔

بُنیادی تصور یہ ہے کہ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے لیکن اس قبیل کی رباعیوں اور نظموں کے پڑھتے وقت مذکورہ بالا نکتہ کو ہمیشہ مدِ نظر رکھنا چاہئے کہ اقبالؔ کبھی کبھی شاعرانہ شوخیوں پر بھی اُتر آتے ہیں اور اس وقت اُن کے اشعار کا مطلب وہی ہوتا ہے جو لفظوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً اس رباعی میں شاعر نہایت بے تکلفی کے ساتھ خدا سے کہتا ہے کہ پرانے گناہوں کی تکرار سے دل اُکتا گیا۔ اِن کے ارتکاب میں اب کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی اس لئے اب اِس قصّہ کو ختم کر دیجئے۔ شیطان

مخلوق ہے غیر محدود قوتوں کا مالک تو نہیں ہے۔ اِس لئے قدرتی بات ہے کہ اب اِس میں تازہ (جدید) گناہ ایجاد کرنے کی قوت باقی نہیں رہی ہے۔ آخر کب تک باقی رہتی؟ جب دُنیا میں ہر شئے کی ایک حد ہے تو شیطان کی قوت اِس سے کیسے مستثنیٰ ہو سکتی ہے؟ اِس لئے اب آپ اُسے اس ڈیوٹی سے فارغ کر دیجئے۔

دگرگوں عالمِ شام و سحر کر
جہانِ خشک و تر زیر و زبر کر
رہے تیری خدائی داغ سے پاک
مرے بے ذوق سجدوں سے حذر کر

مطلب:۔ یہ رباعی اقبالؔ کی نُدرتِ بیان کی بہترین مثال ہے۔ دراصل وہ خدا سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اس وقت کافرانہ نظام کے تحت زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اس نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی مسلمان کیسے حقیقی معنی میں سجدہ نہیں کر سکتا۔ بیشک وہ سجدہ کرے گا۔ کیونکہ سجدہ کرنے کی اُسے اجازت ہے، لیکن اس کا سجدہ بے ذوق ہوگا۔ یعنی اسے سجدہ میں کوئی لذت نہیں آئے گی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ سجدہ کا لُطف تو اس بات پر منحصر ہے کہ انسان غیر اللہ کے سامنے نہ جھکے اور موجودہ کافرانہ نظام حکومت میں یہ بات ممکن نہیں ہے۔

اے اللہ! بلاشبہ ہم غلام مسلمانوں کے سجدوں سے تیری الوہیت کے دامن پر داغ لگ جائے گا۔ ہمارے سجدے تیری خدائی کی توہین ہیں۔ اس لئے میں تجھ سے ملتجی ہوں کہ تو اس غیر اسلامی نظام کو درہم برہم کر دے۔

اس بات کو اقبالؔ نے اس انداز سے کہا ہے کہ رُوح وجد میں آجاتی ہے:۔

رہے تیری خدائی داغ سے پاک
مرے بے ذوق سجدوں سے حذر کر

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ اے خدا میں تیری جناب میں بے ذوق سجدے پیش کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس طرح میں تیری الوہیت کی توہین کے جُرم کا مرتکب ہو جاؤں گا۔ لہٰذا تو اس عالم و غیر قرآنی حکومت کو دگرگوں اور زیر و زبر کر دے۔

میں نے جو یہ بات لکھی ہے کہ کافرانہ نظامِ حکومت میں بھی سجدہ کی اجازت ہوتی ہے، یہ بات اقبالؔ کے اس شعر سے ماخوذ ہے:۔

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

حکومت اِس سجدہ کی اجازت اِس لئے دیتی ہے کہ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ یہ سجدہ جو مسلمان مسجد میں جا کر کرے گا، "بے ذوق" ہوگا اس لئے اِس سے وہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا جو "سجدہ" سے مقصود ہے۔ لہٰذا ابلیس اِس بے ذوق سجدہ کی اجازت دے دیتا ہے۔

"بے ذوق سجدہ" اقبالؔ کی اصطلاح ہے؛ چنانچہ کہتے ہیں:۔

صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

اِس شعر سے "بے ذوق" کا مفہوم واضح ہو سکتا ہے یعنی اگر مسلمان کا دل "جذبِ اندروں" سے خالی ہے تو سجدہ یقیناً بے ذوق ہوگا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ سجدہ

بے ذوق سے وہ سجدہ مُراد ہے جس کا کوئی اثر ساجد کی زندگی پر مرتب نہ ہو یعنی وہ سجدہ جو مسلمان کی زندگی میں کوئی اِنقلاب پیدا نہ کر سکے۔ مثلاً تھسکہ میرانجی ضلع کرنال میں ایک بزرگ رہتے تھے، ساری عمر سجدے کرتے رہے لیکن ان کی زندگی میں کوئی اِنقلاب پیدا نہیں ہوا۔ آخر وقت تک انگریزوں کی نظروں میں محترم رہے اور وفات کے بعد بھی کئی تمغے اپنے ساتھ لے گئے تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئیں۔

۴

غریبی میں ہوں محسودِ امیری
کہ غیرت مند ہے میری فقیری
حذر اس فقر و درویشی سے جس نے
مسلماں کو سکھا دی سربزیری!

مطلب:۔ اِس رباعی میں اقبالؔ نے فقر کی دو قسمیں بیان کی ہیں ایک فقر کافرانہ ہے۔ دوسری قسم مومنانہ ہے چنانچہ اُنہوں نے "مثنوی پس چہ باید کرد" میں اِس امتیاز کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے، میں صرف ایک شعر لکھتا ہوں:۔

فقرِ کافر خلوتِ دشت و دراست
فقرِ مومن لرزۂ بحر و براست

یعنی فقر وہ صفت ہے جو کافر میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور مومن میں بھی لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے:

(الف) کافر کا فقر اُسے جنگل میں خلوت کی زندگی بسر کرنے پر مائل کرتا ہے۔

(ب) مومن کا فقر اُسے میدانِ جہاد میں سرفروشی کی ترغیب دیتا ہے۔

اِسی امتیاز کو بالفاظِ دگر اقبالؔ نے اِس رباعی میں پیش کیا ہے یعنی ایک فقر وہ ہے جو انسان میں غیرت کا مادہ پیدا کر دیتا ہے۔ اور اس غیرت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ فقر غیر اُللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔ (فقرِ غیور، اِسلام ہی کا دوسرا نام ہے)

دوسرا فقر وہ ہے جو انسان کو غلامی کا سبق پڑھاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ غیر اُللہ کے سامنے دستِ سوال دراز کر دیتا ہے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ اے مُسلمان! وہ فقر اختیار کر جو تجھ میں غیرت کا مادہ پیدا کر دے۔ تاکہ بڑے بڑے بادشاہ تیری فقیری پر حسد کریں اور اُس فقر سے اجتناب کر جو تیرے اندر غلامی کا رنگ پیدا کر دے۔ کیونکہ یہ فقر اسلام کی ضد ہے۔

افسوس یہ ہے کہ مُسلمان نے فقر کی پہلی صورت کو فراموش کر دیا اور دوسری صورت کو اختیار کر لیا۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "نواب" بھی ہو گیا "خان بہادر" بھی بن گیا اور "سر" کا خطاب بھی مل گیا لیکن غیرت کا مادہ فنا ہو گیا یعنی جیتے جی مر گیا۔

واضح ہو کہ مسلمانوں کی تاریخ میں متعدد مثالیں اِس بات کی موجود ہیں کہ بڑے بڑے باجبروت بادشاہ، فقیروں کی شان و شوکت پر حسد کرتے تھے۔ اقبالؔ نے جو یہ لکھا ہے کہ غیرت مند فقر، محسودِ امیر ہوتا ہے یہ اظہارِ حقیقت ہے شاعری نہیں ہے۔

کون نہیں جانتا کہ سُلطان علاؤالدین خلجی جس کا شمار ہندوستان کے عظیم المرتبت فرمانرواؤں میں کیا جاتا ہے، اپنے عہد کے مشہور فقیر حضرت محبوبِ الٰہی سُلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کی طرف سے دل میں حسد رکھتا تھا، لیکن حضرت موصوف کی جلالتِ شان سے اِس درجہ خائف تھا کہ مجالِ دم زدن نہ تھی۔

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلّی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارۂ غیر
نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

تمہید:۔ واضح ہو کہ اِس رُباعی میں اقبالؔ وحدتِ شہود کا نظریہ پیش کیا ہے اور جب تک اِس کی وضاحت نہ کی جائے اِس رُباعی کا مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اِس لئے میں پہلے نہایت اختصار کے ساتھ اِس مسئلہ کی تشریح درج کروں گا اس کے بعد اِس رباعی کا مفہوم بیان کروں گا۔

سنہ ۱۹۳۴ء کا ذکر ہے میں نے ایک ملاقات کے دوران میں علّامہ سے عرض کی کہ مجھے مسئلہ وحدۃ الوجود سمجھا دیجئے۔ اِس پر اُنھوں نے یہ جواب دیا کہ

"یہ حقیقت یہ مسئلہ قال سے تعلق نہیں رکھتا، جب تک تم پر یہ حالت طاری نہ ہو کہ اللہ کے سوا کسی کا وجود ہی نہیں ہے اُس وقت تک تم اِس مسئلہ کو کما حقہٗ نہیں سمجھ سکتے۔ علاوہ بریں اِس کی تعبیر بذریعہ الفاظ بہت دشوار ہے بلکہ اس قدر نازک ہے کہ اگر بیان کرنے والے سے معمولی سی فروگذاشت ہو جائے یا سُننے والا غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے تو دونوں صورتوں میں کفر یا الحاد لازم آجاتا ہے اِس لئے تم بطورِ خود اِس کو سمجھنے کی کوشش کرو"

یہ سُن کر اگرچہ فوری طور پر مجھے بڑی مایوسی ہوئی لیکن میں نے اللہ کا نام لے کر کوشش شروع کر دی۔ اِس بیس بائیس سال کے عرصہ میں جو کچھ پڑھا اِس کی تفصیل کا نہ یہ موقع ہے اور نہ صفحات اِس کی اجازت دے سکتے ہیں صرف اِس قدر لکھنا

کافی ہے کہ فصوص الحکم، مکتوبات اور مثنوی پڑھنے کے بعد جب حضرت علّامہ سرآمدِ حکمائے ہند مولانا مولوی فضل حق صاحب خیرآبادیؒ کے رسالہ روض المجود اور اُن کے فرزند اور جانشین شمس العلماء راس الحکماء مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی مرحوم کے شاگرد حضرت مولانا حکیم برکات احمد صاحب ٹونکی مرحوم کے رسالہ تحقیق حقۃ الوجود کا مطالعہ کیا تو میں نے بھی یہی مسلک اختیار کر لیا کہ لا موجود الا اللّٰہ۔ اور مجھے خوشی ہے کہ آخر عمر میں حضرت اقبالؔ بھی وجودی ہو گئے تھے۔ ناظرین کی آگاہی کے لئے اِس قدر صراحت ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص خالی الذہن ہو کر اس مسئلہ پر غور کرے گا تو میں یقین دلاتا ہوں کہ وحدتِ وجود کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ اِس عقیدہ سے کائنات کی گتھی بھی سُلجھ جاتی ہے۔ اور طمانیت قلبی بھی نصیب ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ علمائے ظاہر یا متکلّمین کے نزدیک لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مطلب یہ ہے کہ ایک اللہ کے سوا اور کوئی اِلٰہ موجود نہیں ہے یعنی ایک خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔ لیکن حضراتِ صوفیہ کے نزدیک توحید کا مفہوم یہ ہے کہ ایک خدا کے سوا اور کسی شے کا وجود ہی نہیں ہے یعنی خدا کے سوا اور کوئی چیز (ہستی) عالم میں موجود ہی نہیں ہے یہ عالم ذاتِ باری سے علیحدہ کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا۔

یہاں تک تمام صوفیہ متفق ہیں۔ لیکن اِن میں اِس بات پر اختلاف رونما ہوا کہ جب یہ عالم، جس کی حقیقت عدم ہے، حق تعالیٰ کی ایجاد سے موجود ہوا تو اِس عالم نے اپنا یہ وجودِ مستعار کس طرح حاصل کیا؟ یعنی وجود کے ساتھ اس کے متصف ہونے کی کیفیت کیا ہے؟ یا اِس عالمِ موجود کو وجود کے ساتھ کیا رابطہ ہے۔

شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی کا مذہب یہ ہے کہ خدا، وجودِ مطلق یا ہستی مطلق ہے۔

جب یہ وجودِ مطلق، تعیّنات کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے تو ممکنات کی مختلف انواع مثلاً انسان، حیوان، شجر، حجر، شمس و قمر اور دیگر اشیاء پیدا ہو جاتی ہیں۔ یعنی ممکنات کی ماہیت اسماء و صفاتِ الٰہیہ ہیں۔ اِنہی اسماء و صفات کی تجلیات سے حقائق ممکنات عالم میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ممکنات، اگرچہ موجود نظر آتی ہیں لیکن اِن کا وجود، محض وہمی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مخلوقات کا درحقیقت وجود ہی نہیں ہے مخلوقات کی کثرت سے حق تعالیٰ کی وحدت باطل نہیں ہو سکتی کیونکہ مخلوقات کا درحقیقت وجود ہی نہیں ہے۔ جو کچھ نظر آتا ہے سب اسماء و صفات کی تجلّیات کا کرشمہ ہے۔ اِسی خیال کو ایک شاعر نے یوں نظم کیا ہے۔

باوحدتِ حق زکثرتِ خلق چہ باک
صد جائے اگر گرہ زنی رشتہ یکے است

یعنی تاگے میں اگر سَو جگہ گرہیں لگا دی جائیں تو اُن سے تاگے کی وحدت باطل نہیں ہو سکتی یا تاگے کے علاوہ کسی اور شئے کا وجود ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ ان گرہوں کا وجود، اگرچہ بظاہر موجود ہے لیکن در اصل تاگے کے سوا، یہ گرہیں کوئی زاید یا جداگانہ وجود نہیں رکھتیں۔ دراصل یہ تاگا ہے جو گرہوں کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے۔ یعنی گرہ، تاگہ ہی کی بدلی ہوئی صورت کا نام ہے۔ اِسی طرح عالم میں جس قدر اشکال نظر آتی ہیں یہ سب وجودِ مطلق ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہی وجودِ واحد تشخصات اور تعیّنات کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ اگر ان تعیّنات سے قطع نظر کر لی جائے تو اللہ کے سوا اور کوئی شئے موجود نہیں ہے جو کچھ نظر آتا ہے یہ محض وہم و خیال ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

پردہ کو تعین کے درِ دل سے اُٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا (سوداؔ)

محققین صوفیہ، حضرت ابن عربیؒ کی اس تعبیر کو وحدتِ وجود کہتے ہیں۔

دوسرے گروہ کے نزدیک ممکنات کی ماہیت یہ ہے کہ وہ اسماء و صفاتِ الٰہیہ کے عکوس و اظلال ہیں۔ مثلاً آدمی کا سایہ (ظل) جو زمین پر پڑتا ہے، اگرچہ آدمی سے جدا نظر آتا ہے لیکن دراصل اس کا وجود نہیں ہے۔ فی الحقیقت جو کچھ ہے آدمی ہی ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو سایہ بھی نہ ہوتا۔

نمی دانم کہ ایں تابندہ گوہر
کجا بودے اگر دریا نبودے (ارمغانِ حجاز)

اسی طرح دراصل صرف خدا موجود ہے، ممکنات جس قدر نظر آتی ہیں یہ سب اسی کی صفات کا ظل یا عکس یا پرتو ہیں ہر شئے اُس کی صفات کا مظہر ہے اور ہر شئے میں وہی جلوہ گر ہے۔ یہ حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کی تعبیر ہے۔ اور اس کو وحدتِ شہود کہتے ہیں۔

ہمہ اوست کی اِن دونوں تعبیروں کا مطلب ایک ہی ہے کہ کائنات میں حق تعالیٰ کے سوا غیر کا حقیقی وجود ثابت نہیں ہے۔ ناظرین اِس لفظ "غیر" کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کیونکہ اقبالؔ نے اپنی رباعی میں اسی عقیدے کی تلقین کی ہے کہ اگر مسلمان "غیر اللہ" کے وجود کو تسلیم کریگا تو کافر ہو جائے گا۔

ع نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

ایک محقق نے اس عقیدہ کو اس شعر میں پیش کیا ہے۔[1]

---

[1] دیکھو اگلا صفحہ۔

کُلُّ مَافِی الْکَوْنِ وَھْمٌ اَوْ خَیَالٌ
اَوْ عُکُوْسٌ فِی الْمَرَایَا اَوْ ظِلَالٌ

یعنی کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے اس کی حقیقت اِس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ یا تو وہم ہے یا خیال ہے یا آئینہ میں عکس کی حیثیت رکھتا ہے یا ظِلّ (سایہ) ہے اسماء و صفاتِ الٰہیۃ کا۔[1]

اِسی حقیقت کو میرے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ نے یوں بیان فرمایا ہے۔

دو عالم میں نہیں موجود و مشہود
بجز ذات و صفات، افعال و آثار

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سوائے اُس ایک وجودِ مطلق حقیقی مجرد عن الخارجی کے، جو باعتبارِ ذات، وراء الوراء ہے جملہ موجوداتِ عالم وہم و خیال یا عکوس و اظلال کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں۔

عکس افتاد با آئینۂ ہوش
گل تواں گفت دلے چیدن نیست (بیدلؔ)

میں نے ابتدائے بحث میں یہ لکھا ہے کہ وحدتِ وجود کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اِس لئے اب اِس دعویٰ کو ثابت کرتا ہوں۔

واضح ہو کہ خدا بالاتفاق یعنی تمام مسلمانوں کے نزدیک واجب یا قدیم ہے اور

---

[1] جیسے آئینہ میں عکس یا زمین پر انسان کے سایہ کا حال ہے کہ ان کا کوئی وجود نہیں ہے ۱۲

یہ عالم بالاتفاق ممکن یا حادث ہے (حکماء اللہ تعالیٰ کو واجب کہتے ہیں، متکلمین قدیم کہتے ہیں)

لیکن قدیم کسی حادث کی علت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ علت، دو حال سے خالی نہیں ہو سکتی یا تامہ ہو گی یا ناقصہ ہو گی۔

اگر ناقصہ ہے تو (نعوذ باللہ) ذاتِ خداوندی میں نقص ثابت ہو جائے گا۔ اور یہ محال ہے کہ خدا ناقص ہو یا اِس کی کوئی صفت ناقص ہو۔

لامحالہ ماننا پڑے گا کہ خدا علّتِ تامّہ ہے۔ لیکن علّتِ تامّہ سے معلول کا منفک یا جدا ہونا محال ہے۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ علّتِ تامّہ تو موجود ہو لیکن معلول موجود نہ ہو۔ کیونکہ عقل، مشاہدہ اور تجربہ تینوں کا فیصلہ یہ ہے کہ علّتِ تامّہ اور اس کے معلول میں تاخر زمانی محال ہے۔ مثلاً قفل میں کنجی کی گردش تامہ (جو بواسطہ حرکتِ ید وقوع میں آتی ہے) اور قفل کے کُھلنے میں تقدم و تاخر نہیں ہوتا۔ اِدھر گردش تام ہوئی اُدھر قفل کُھلا یہ ناممکن ہے کہ گردش کلید تو تام ہو جائے لیکن قفل اس کے دو سکنڈ کے بعد کُھلے۔

پس اگر خدا علّتِ تامّہ ہے اِس عالم کی، تو عالم کو بھی قدیم تسلیم کرنا پڑیگا۔ یعنی علّت قدیم ہے معلول بھی قدیم ہو گا لیکن معلول چونکہ علّت کا محتاج ہے اس لئے قدیم بالذات تو ہو نہیں سکتا۔ ہاں قدیم بالزمان یا قدیم بالنوع ہو سکتا ہے یعنی حادث بالذات۔

لیکن اگر عالم کو حادث بالذات تسلیم کیا جائے تو سوال پیدا ہو گا کہ ذاتِ باری جو قدیم ہے عالم کی علّت کیسے ہو سکتی ہے کیونکہ حادث اور قدیم میں رابطہ تام

نہیں ہو سکتا تو یہ عالم موجود کیسے ہوا؟ بالفاظِ دگر

خدا قدیم ہے، قدیم کسی حادث کی علّت نہیں ہو سکتا اس لئے خدا عالم کی علّت نہیں ہو سکتا تو عالم کی علّت کیا ہے؟

اس اعتراض سے بچنے کے لئے متکلمین نے یہ پہلو اختیار کیا کہ بیشک قدیم، کسی حادث کی علّت نہیں ہو سکتا۔ لیکن عالم کی علّت خدا نہیں ہے۔ بلکہ اُس کا ارادہ ہے اور ارادہ حادث ہے۔ اِس پر ہمارے تین اعتراضات ہیں۔

(۱) اگر ارادہ حادث ہے تو خدا محلِ حدوث ہو جائے گا، اور یہ عقل کے خلاف ہے۔ کہ ذاتِ خداوندی تو قدیم ہو۔ لیکن اس کی کوئی صفت حادث ہو۔

(۲) اگر ارادہ حادث ہے تو اِس حادث کی علّت کیا ہے؟ حادث تو اپنے وجود میں دوسرے کا محتاج ہوتا ہے۔ اگر خدا علّت ہے تو پھر وہی اعتراض لازم آگیا کہ قدیم، حادث کی علّت کیسے ہو سکتا ہے؟

(۳) اگر ارادۂ خداوندی حادث ہے تو جس وقت بھی ارادہ ہوا، ہمارا یہ سوال ہے کہ اُس وقت کیوں پیدا ہوا؟ اُس سے پہلے کیوں نہیں ہوا؟ یا اُس کے بعد کیوں نہیں ہوا؟ اس میں تین قباحتیں لازم آتی ہیں:۔

(۱) ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے اور یہ محال ہے۔

(ب) دوسری قباحت یہ ہے کہ تخلیق، خیر ہے یا شر ہے؟ اگر شر ہے تو یہ خدا کی شان کے خلاف ہے۔ اگر خیر ہے تو پھر خیر کے صدور میں تاخیر کیوں ہوئی؟

(ج) تیسری قباحت یہ ہے کہ خدا کی تمام صفات کو ایک طویل عرصہ تک معطل ماننا پڑتا ہے۔

انہی اعتراضات سے بچنے کے لئے۔

(۱) بودھ دھرم نے خدا اور روح دونوں ہی کا اِنکار کر دیا۔ صرف مادہ کو قدیم تسلیم کیا، مادہ بھی قدیم ہے اُس کی صفات بھی قدیم ہیں لہٰذا اُن کے مسلک کی رُو سے مذکورہ بالا اعتراضات میں سے کوئی بھی اعتراض ان پر وارد نہیں ہوتا۔

(ب) جین دھرم نے خدا کا انکار کر دیا یعنی رُوح اور مادہ دونوں قدیم ہیں۔ اِن کی صفات بھی قدیم ہیں۔

(ج) ہندو دھرم کے بعض مدارسِ فکر مثلاً سانکھ درشن نے خدا کا اِنکار کیا ہے اور بعض مثلاً نیائے درشن نے یہ پوزیشن اختیار کی ہے کہ خدا روح اور مادہ تینوں قدیم ہیں۔

فی الجملہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ خدا قدیم ہے لیکن عالم حادث ہے تو پھر مذکورہ بالا اعتراضات کا کوئی .... جواب نہیں ہو سکتا اِس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ عالم قدیم بالذّات نہیں ہے۔ بلکہ قدیم بالنوع ہے جیسا کہ محقق دوانی کا مذہب ہے اب اگر عالم قدیم ہے تو تین صورتوں سے ایک صورت ضرور ماننی پڑے گی۔

(۱) خدا بھی قدیم ہے، عالم بھی قدیم ہے اور دونوں قدیم بالذّات ہیں۔ اِس پر ہمارا یہ اعتراض ہے کہ جب عالم بھی قدیم بالذّات ہے تو ہم اُسے معلول کیوں تسلیم کریں۔

بالفاظِ دگر تین قدیم چیزوں میں سے ایک کو علّت اور باقی کو یا ان دو کو معلول کس قاعدہ سے تسلیم کیا جائے؟ خدا کو علّت اور عالم کو معلول کہنا یہ تو ترجیح بلا مرجح ہے جو بالاتفاق باطل ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عالم قدیم ہے لیکن اِس کا کوئی خالق نہیں ہے مگر کوئی عقلمند آدمی اِس صورت کو تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ عالم میں باقاعدہ قانون نظم اور ضبط پایا جاتا ہے اور یہ باتیں بلا شعور مادہ سے صادر نہیں ہو سکتیں اور اگر یہ تسلیم

کیا جائے کہ عالم میں مادہ کے علاوہ روح بھی ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ روح کو کیا ضرورت لاحق ہوئی کہ وہ مادہ کی قید میں آکر گرفتارِ بلا ہو گئی؟ ضرور کوئی بالاتر ہستی ہے جس نے اِن دونوں کو متحد کر دیا ہے۔ لہٰذا اب تیسری صورت رہ جاتی ہے کہ عالم موجود ہے لیکن خدا سے جدا گانہ یا علیحدہ کوئی وجود ہی نہیں رکھتا بلکہ اُسی ذاتِ واحد کے مختلف مظاہر کا نام ہے۔ جب دوئی مٹ گئی تو ربط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حضرت شیخ اکبرؒ اور حضرت مجدد الفِ ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ اور دوسرے اکابرِ صوفیہ کا یہی مذہب ہے کہ

عالم کی ماہیت وجود نہیں ہے بلکہ عدم ہے۔ اِس کی تفصیل یہ ہے کہ اصحابِ کشف و شہود نے اپنے نورِ باطنی سے اِس حقیقت کا ادراک کیا ہے کہ یہ عالم جس کی ماہیت عدم ہے، عبارت ہے تجلیاتِ حق تعالیٰ سے۔ جو وجودِ مطلق ہے تمام مظاہر ممکنات میں۔ چنانچہ حضرت مجدد الفِ ثانیؒ مکتوبات میں لکھتے ہیں کہ "جنابِ باری تعالیٰ وجودِ مطلق است و غیرِ او ہمہ معدومات ہستند"، یعنی اللہ تعالیٰ وجودِ مطلق ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ نظر آتا ہے سب معدوم ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضراتِ وجودیہ اور شہودیہ میں وحدتِ وجود میں اختلاف نہیں ہے۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ اِس کی تعبیر میں ہے۔ یعنی اِس بات میں کہ ممکنات کی ماہیت کیا ہے۔ دونوں گروہ یہ مانتے ہیں کہ وجودِ مطلق تو صرف حق تعالیٰ کا ہے۔ ممکنات تمام معدوم ہیں اِن کا وجود ظلّی ہے حقیقی نہیں ہے۔

حضراتِ وجودیہ کہتے ہیں کہ ممکنات کی ماہیت یا حقائقِ ممکنات اسماء و صفاتِ باری ہیں۔ اِن اسماء و صفات کی تجلّی سے ممکنات کا ظہور ہوا اور یہ تجلّی قدیم ہے۔

کیونکہ ذاتِ باری قدیم ہے اِس لئے فلسفیانہ طور پر کہہ سکتے ہیں کہ عالم بھی قدیم ہے اگرچہ قدیم بالذّات نہیں ہے کیونکہ اِس کا تو کوئی ذاتی وجود ہی نہیں ہے ہاں قدیم بالنوع کہہ سکتے ہیں۔

چونکہ حق تعالیٰ کی صفات کی تجلّی حقائقِ ممکنات میں ظاہر ہوئی ہے اِس لئے وجودِ ممکنات ظلّی ہے یعنی ظلِّ اسماء و صفاتِ باری تعالیٰ ہے لیکن یہ ظل بذاتہٖ معدوم ہے اِس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے شعلہ جوالا کی گردش سے بظاہر دائرہ آتشیں مشہود ہوتا ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اِس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ محض فریبِ نظر ہے۔

ع   عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

حضرت شہودیہ کہتے ہیں کہ حقائقِ ممکنات و ممکنات کی ماہیت، اسماء و صفات کے ظلال و عکوس ہیں یعنی مرتبۂ علم میں حقائقِ ممکنات مرکب ہیں، عدمِ اضافی اور ظلِّ صفاتِ حقیقیہ سے، لیکن یہ ظل چونکہ اسماء و صفات کی تجلّی سے ظاہر ہوا ہے۔ اِس لئے بذاتہٖ معدوم ہے۔ لیکن بظاہر موجود ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دونوں کے نزدیک عالم کا وجود ظلّی ہے، فرق یہ ہے کہ

شیخ اکبرؒ یہ کہتے ہیں کہ یہ ظل موہوم ہے

حضرت مجددؒ یہ کہتے ہیں کہ یہ ظل موجود ہے

علّامہ اقبالؒ، حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کے تبع ہیں اور حضرت مجدد صاحبؒ، مولانا رومؒ کے تبع ہیں۔ راقم الحروف اِن تمام بزرگوں کا مقلّد ہے۔

اب ایک شبہ کا ازالہ کرنا اور باقی رہ گیا وہ یہ کہ یہ تعبیر بظاہر قرآن مجید کے خلاف معلوم ہوتی ہے اِس کا جواب یہ ہے کہ وحدتِ وجود یا وحدتِ شہود قرآن کے خلاف

نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت مجدد الف ثانیؒ اس عقیدہ کو کس طرح تسلیم کر سکتے تھے؟ کتاب اللہ میں اس قسم کی بہت سی آیات موجود ہیں جن سے صراحتًا یہ ثابت ہوتا ہے کہ کائنات میں اللہ کے سوا حقیقی معنی میں کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ چند آیات ذیل میں درج کرتا ہوں۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ یعنی اللہ ہی ساری کائنات کا مبدع اور خالق ہے وہی سب سے پہلے ہے اور وہی سب سے آخر ہے اور جو کچھ نظر آتا ہے اس میں اُسی کی ذات کا ظہور ہو رہا ہے۔ اور وہی ہر شئے میں پنہاں ہے اور وہ ہر شئے کی حقیقت سے آگاہ ہے یہ آیت مسلکِ وحدۃ الوجود پر نص صریح ہے۔

دوسری آیت:۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ

ہم انسان سے اُس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں

تیسری آیت:۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ

اللہ ہی ساری کائنات کا نور ہے (الی آخرہٖ)

چوتھی آیت:۔ اَلَا اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ

یعنی اللہ نے ہر شئے کا احاطہ کر رکھا ہے

پانچویں آیت:۔ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ

تم جس طرف بھی منہ کرو گے اُسی طرف خدا موجود ہے

چھٹی آیت:۔ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ

خدا کے سوا ہر شئے فنا ہو رہی ہے

ساتویں آیت:۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ

نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر دھوکہ کی پونجی

آٹھویں آیت:۔ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ

یعنی تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے

نویں آیت:۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ

اور جب میرے بندے میرے متعلق آپ سے سوال کریں تو

آپ کہہ دیجئے کہ میں اُن کے بہت قریب ہوں

دسویں آیت:۔ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ

یعنی جان لو کہ اللہ حائل ہو جاتا ہے آدمی اور اس کے دل کے درمیان (۸:۲۴)

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لبید کا یہ قول سنا کہ اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ، یعنی آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے سب باطل ہے تو فرمایا اَصْدَقُ كَلِمَةٍ قَالَهَا الْعَرَبُ قَوْلُ لَبِيْدٍ یعنی کسی عرب نے اس سے زیادہ سچا جملہ اپنی زبان سے ادا نہیں کیا اور جملہ کا مطلب یہی ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی شئے حقیقت میں موجود نہیں ہے۔

اس مختصر لیکن ضروری تمہید کے بعد اس رباعی کے بعض الفاظ کی تشریح درج کرتا ہوں۔

(۱) اقبالؔ نے خرد کو تنگ دامن قرار دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی عقل جزو بین ہے وہ بیک وقت ساری کائنات کا مجموعی علم حاصل نہیں کر سکتی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا دارو مدار حواس پر ہے اور حواس کا دائرہ عمل محدود ہے۔ عقل کے مقابلہ میں وجدان یا عشق کل بین ہے یعنی وہ ایک آن میں ساری کائنات کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ اقبالؔ نے اس شعر میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے۔

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

(۲) تجلی سے وہی اسماء و صفاتِ الٰہیہ کی تجلیات مراد ہیں جن کا شمار انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ کائنات میں جس قدر اشیاء نظر آتی ہیں یہ سب تجلیات ہی تو ہیں۔ قرآن مجید کی یہ آیت اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (۵۵:۲۹)

یعنی حق تعالیٰ ہر لحظہ اور ہر آن اپنی ذات و صفات کی تجلیات نازل کرتا رہتا ہے۔ اگر تجلیات کا نزول ایک سکنڈ کے ہزارویں حصہ کے لئے بھی رک جائے تو ساری کائنات معدوم ہو جائے جس طرح ہاتھ کی گردش رک جائے تو دائرۂ آتشیں فورًا معدوم ہو جائے گا۔

(۳) نظارۂ غیر سے غیر اللہ کا وجود مراد ہے۔

(۴) نگہ کی نامسلمانی سے عقل کی نادانی یا حقیقت سے بیگانگی مراد ہے۔

(۵) "گوارا ہے اسے نظارۂ غیر" اس مصرع میں اقبالؔ نے تصوف کو تغزل کے لباس میں پیش کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عقلِ انسانی اپنی جہالت اور نادانی کی بنا پر کائنات میں ماسوا اللہ کے وجود کو تسلیم کر لیتی ہے۔ لیکن اقبالؔ نے اس نکتہ کو فلسفیانہ انداز کے بجائے شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ اسی لئے لفظ "گوارا" استعمال کیا ہے یعنی عقل اُس عاشق کی مانند ہے جو ابھی طریقِ عاشقی میں خام ہے اسی لئے وہ اپنے معشوق کے علاوہ غیر (دوسرے معشوقوں) کو بھی دیکھنا گوارا کر رہا ہے۔ واضح ہو کہ جب عاشق اپنے عشق میں پختہ ہو جاتا ہے تو پھر غیر کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا بلکہ اُسے غیر نظر ہی نہیں آتا:۔

تیرے سوا مجھے کوئی نظر نہیں آتا
میرے سوا تجھے یوں کون دیکھ سکتا ہے (احسان دانش)

تغزل کے اعتبار سے "غیر" سے مراد ہے اپنے معشوق کے علاوہ کوئی اور معشوق (جو موجود ہے) تصوف کے اعتبار سے "غیر" سے مراد ہے۔ اللہ کے سوا دوسرے کا وجود (جو موجود نہیں ہے)

(۶) نگہ سے اگرچہ نگاہ بھی مراد ہو سکتی ہے لیکن دراصل اقبال نے یہاں نگہ کو عقل کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ وہ یہاں لفظ "خرد" بھی لکھ سکتے تھے۔ لیکن "نگہ" سے ایہام پیدا ہو گیا اور ایہام سے بلاغت کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

اب میں اس رباعی کا مطلب بیان کرتا ہوں:۔

کہتے ہیں کہ انسانی عقل کی تنگ دامانی پر افسوس ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتی کہ کائنات میں ہر شئے مظہرِ ذاتِ باری ہے۔ بذاتِ خود کسی شئے کا وجود نہیں ہے یعنی کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب اسماء و صفات کی تجلیات ہیں۔ کائنات بذاتِ خود معدوم ہے۔ خرد کی اس کوتاہ بینی کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ کائنات میں غیر اللہ کے وجود کو تسلیم کر لیتی ہے اور اس اعتراف کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ کائنات کو وجود میں حق تعالیٰ کا شریک قرار دیتی ہے اور یہ کھلا ہوا شرک ہے اور شرک منافی توحید ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے علاوہ کائنات کو بھی حقیقی معنی میں موجود مانتا ہے وہ مشرک ہو جاتا ہے۔ یعنی مسلمان وہ ہے جو اللہ کے سوا اور کسی کو حقیقی معنی میں موجود یقین نہیں کرتا۔ یہ کائنات موجود تو ہے لیکن اس کا وجود اصلی یا حقیقی نہیں ہے بلکہ ظلی ہے یعنی یہ کائنات ظل ہے اسماء و صفاتِ الٰہیہ کا۔ یعنی حقیقی معنی میں اللہ کے سوا اور کوئی شئے

موجود نہیں ہے۔ پس کلمۂ طیبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مطلب ہے لا موجود الا اللہ یہی مسلک ہے حضراتِ صوفیہ کا اور یہی مسلکِ حق ہے اور اسی مسلک کی اقبال نے تلقین کی ہے[1]۔

کہا اقبال نے شیخِ حرم سے
تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؟

حلِ لغات:۔ اقبال سے مراد ہے مسلمانوں کا انگریزی داں طبقہ جو مغربی علوم سے باخبر ہے۔ شیخِ حرم سے مراد ہے مسلمانوں کا عربی داں طبقہ جو حالاتِ حاضرہ سے بے خبر ہے اور عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ناواقف ہے۔ محرابِ مسجد سے مذہبی ماحول مراد ہے۔ سو گیا یعنی تبلیغ و اشاعتِ اسلام سے غافل ہو گیا۔ مسجد کی دیواروں سے روحِ اسلام مراد ہے۔ فرنگی بتکدہ سے غیر اسلامی تصورات اور افکار مراد ہیں۔

مطلب:۔ اقبال نے ایک عالمِ دین سے یہ شکوہ کیا کہ آپ کی زندگی صرف دینی علوم کی چار دیواری میں محدود ہے آپ ہر وقت مسجد میں دینی علوم کا درس دیتے رہتے ہیں لیکن عصرِ حاضر کے تقاضوں سے بالکل بے خبر ہیں، یورپ میں تبلیغ و اشاعت

---

[1] اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے بھی اس شعر میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے:۔
فریبِ عقل ظاہر بیں ہے یہ سب، ورنہ اے اکبر — ہمیں فانی ہمیں باقی، ہمیں پنہاں ہمیں پیدا

اسلام کا کوئی نظام قائم نہیں کرتے۔

یہ اعتراض سن کر اسلام کی روح نے اقبال سے کہا کہ یہ تو سچ ہے کہ علماء مغربی علوم سے ناواقف ہیں۔ اس لئے بلادِ مغرب میں تبلیغ و اشاعت کے لئے نہیں جاتے لیکن بہرحال اُن کے دم سے تمہاری مسجدیں تو آباد ہیں۔ اگر وہ نہ ہوں تو تمام مسجدیں ویران ہو جائیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ نمازِ فجر کے وقت تم اس لئے مسجد میں نہیں آسکتے کہ وہ تمہارے سونے کا بہترین وقت ہے۔ جو شخص بارہ ایک بجے رات کو کلب یا ہوٹل یا سینما سے واپس آئے گا وہ چار بجے کیسے بیدار ہو سکتا ہے؟ ظہر کے وقت تم اس لئے نہیں آسکتے کہ اس وقت ناولوں کا مطالعہ کرتے ہو۔ عصر کے وقت اس لئے نہیں آسکتے کہ دفتر سے کوٹھی جاتے ہو۔ مغرب کے وقت اس لئے نہیں آسکتے کہ کلب میں ہوتے ہو۔ عشاء کے وقت اس لئے نہیں آسکتے کہ ڈنر کھانے یا پکچر شو دیکھنے جاتے ہو۔

اندریں حالات تم خود انصاف کرو کہ اگر ان لوگوں کا وجود نہ ہو تو تمہاری مسجدیں کون آباد کرے؟ یہ لوگ بیشک یورپ میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام سے غافل ہیں لیکن تم اپنی خبر لو! یہ تو غافل ہیں، بے خبر ہیں، لیکن کچھ نہ کچھ خدمت ضرور کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ تم کیا کر رہے ہو؟ تمہاری حالت تو یہ ہے کہ تم فرنگی خیالات، افکار، عقائد اور نظریات میں اس قدر مستغرق ہو کہ دین ہی سے بیگانہ ہو چکے ہو۔

ملا بیشک سو رہا ہے لیکن وہ بہرحال مسجد میں سو رہا ہے تم اپنی تو کہو۔ "ازیں سو رانده وازاں سو درمانده" کا مصداق بنے ہوئے ہو۔ مسجد میں اس لئے نہیں آتے کہ آنے کا وقت نہیں ملتا۔ فرنگیوں کو تبلیغِ اسلام اس لئے نہیں کرتے کہ دین سے بیگانہ ہو۔

اب سوچو کہ کون زیادہ قابلِ ملامت ہے؟ کون بڑا مجرم ہے؟ ملا تبلیغ نہیں

کرتا لیکن مسجدوں کو تو آباد کر رہا ہے۔ تم تو اس سے بدرجہا زیادہ قابلِ ملامت ہو کہ نہ مسجدوں کو آباد کرتے ہو نہ تبلیغِ اسلام کرتے ہو۔

یہ تو ہے کہ وہ مسجد میں سو گیا لیکن تم بھی تو بتکدہ میں کھو گئے اور اگر انصاف سے کام لو تو تمہیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ مسجد بہرحال بتکدے سے افضل ہے۔ مسجد میں سو رہنا بتکدہ میں کھو جانے سے بہر کیف بہتر ہے۔

کہن ہنگامہ ہائے آرزو سرد
کہ ہے مردِ مسلماں کا لہو سرد
بتوں کو میری لادینی مبارک
کہ ہے آج آتشِ اَللّٰہُ ھُوْ سرد

حلِ لغات:۔ کہن ہنگامہ ہائے آرزو سے جہاد کا ولولہ مراد ہے۔ کیونکہ صدرِ اسلام کے مسلمانوں کی سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ اللہ کے راستہ میں جہاد کیا جائے خواہ وہ تلوار سے ہو یا مال سے یا زبان سے یا قلم سے۔

نوٹ:۔ چونکہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے سے پہلے نفسِ امارہ کے خلاف جہاد اشد ضروری ہے اسی لئے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو "جہادِ اکبر" قرار دیا ہے اور شریعت کی زبان میں اسے تزکیۂ نفس کہتے ہیں۔ راقم الحروف کا ایمان ہے کہ صحبتِ مرشد کے بغیر کوئی شخص نفسِ امارہ کو زیر نہیں کر سکتا، اسی لئے مولانا روم فرماتے ہیں:۔

یک زمانہ صحبتے با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

"کہ ہے مردِ مسلماں کا لہو سرد" اس سے مراد یہ ہے کہ وہ جذبہ جو خون میں

جہاد کا ولولہ پیدا کر سکتا تھا، فنا ہو گیا یعنی عشقِ رسول کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ واضح ہو کہ جب تک انسان میں جنون کا رنگ پیدا نہ ہو وہ سر سے کفن باندھ کر میدانِ جہاد کی طرف نہیں جا سکتا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ میں یہی جنون تو پیدا کر دیا تھا جو ہر وقت موت کے آرزومند رہتے تھے۔ چنانچہ بطلِ اسلام، سیف اللہ الجبار حضرت خالد بن ولیدؓ نے ایرانی افواج کے سپہ سالار کو اس کے خط کے جواب میں یہ تاریخی فقرہ لکھا تھا کہ "تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہیں ایسی قوم سے سابقہ پڑا ہے جو موت کی اُسی قدر آرزومند ہے جس قدر تم زندگی کے طلبگار ہو"۔

علامہ اقبال بھی یہی چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے اندر جہاد کا ولولہ پیدا ہو جائے اسی لئے انہوں نے ساری عمر قوم کو عشقِ رسولؐ کا درس دیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں نے ان کے کلام کی شرح میں ان کی تعلیمات کے اسی پہلو کو ہر جگہ نمایاں کیا ہے تاکہ مرحوم کے مقصد کی تکمیل ہو سکے۔

زندگی کے آخری دور میں یہی آرزو مرحوم کے دل میں ہر وقت چٹکیاں لیتی رہتی تھی کہ کسی طرح مسلمانوں میں مرنے کی آرزو پیدا ہو جائے[1]۔ چنانچہ نومبر ۳۷ء میں ایک دن دورانِ گفتگو میں راقم الحروف نے یہ سوال کیا کہ اس وقت قوم کی خدمت کی بہترین صورت کیا ہے؟ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ علامہ مرحوم جاوید منزل کی پورچ سے متصل

---

[1] اکبر الٰہ آبادی نے بھی یہی تعلیم دی ہے، صرف ایک شعر لکھتا ہوں:۔
جو دیکھی ہسٹری اس بات پر کامل یقین آیا
جسے مرنا نہیں آیا اُسے جینا نہیں آیا

چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے، میرا یہ سوال سُن کر فرمانے لگے، بس تم کسی طرح مسلمانوں کی رگوں میں خون دوڑا دو۔ مغربی تعلیم نے اِن کا خُون منجمد کر دیا ہے۔ اِس لئے جو شخص اُن کے خُون میں گرمی پیدا کر دے وہ شخص میری رائے میں اِس وقت اسلام کا سب سے بڑا خادم ہے۔ میں نے دوبارہ سوال کیا کہ خُون کس طرح دوڑایا جائے؟ جواب دیا اس کی کئی صورتیں ہیں۔ تمہارے لئے جو صورت آسان ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کو اُن کے اسلاف، خصوصاً صحابہ کرام کے کارناموں سے آگاہ کرو۔ میں نے بھی جاوید نامہ میں سُلطان ٹیپو شہیدؒ اور دوسرے ناموروں کا تذکرہ اِسی مقصد کے لئے کیا ہے۔ پھر تاریخِ اسلامی کی اہمیت پر اظہارِ خیالات کیا اور آخر میں یہ کہا کہ میری رائے میں مسلمانوں کے زوال کا بڑا سبب یہ ہے کہ اِن کا لہو بالکل سرد ہو گیا ہے۔"

مطلب:۔ دراصل اِس رُباعی میں اقبالؔ نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب سے بحث کی ہے اور تیسرے مصرع میں بتوں کو مبارکباد دے کر اپنی طنز نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ اقبالؔ نے یہ نہیں کہا کہ ہنگامہ ہائے آرزو کے فنا ہو جانے سے مُسلمان "لادین" ہو گیا، کیونکہ اِس میں نہ کوئی ندرت ہے نہ تاثیر۔ اِس لئے اُنہوں نے وہ پیرایۂ بیان اِختیار کیا جس میں طنز کے ہزاروں نشتر پوشیدہ ہیں۔ اِس میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ شاید پڑھنے والے کے دِل میں اِن میں سے کوئی نشتر چُبھ جائے!

اِس رباعی کے تصوّرات میں ایک خاص منطقی ربط پایا جاتا ہے۔ جو اقبالؔ کی اکثر رباعیات کا طغرائے اِمتیاز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شاعر ہونے کے علاوہ منطقی بھی تھے جس کا ثبوت اُن کے خطباتِ مدراس سے مل سکتا ہے۔

(۱) کہتے ہیں کہ سب سے پہلے آتشِ اللہ ہو سرد ہوئی یعنی ملوکیت کی بدولت مُسلمان کا

دِل اللہ کی محبّت سے بیگانہ ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ ملوکیت اِنسانوں کو اپنا بندہ بناتی ہے اِس لئے اللہ سے بیگانہ کر دینا غافل کر دینا یا دُور کر دینا، ملوکیت کا پہلا قانون ہے۔

(ب) اِس محبّتِ الٰہی کا جذبہ کے فنا ہو جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ عشقِ رسولؐ کا جذبہ فنا ہو گیا۔ قرآن مجید فرماتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ یعنی جو لوگ مومن ہیں (اِن کی شناخت یہ ہے) کہ وہ اللہ کی محبّت میں اشد ہوتے ہیں۔ یعنی اللہ کی محبّت اِن کے دل میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ عورت، بیوی، دولت، اولاد، جاگیر، عہدہ، خطاب اور محلات سب سے زیادہ واضح ہو کہ اللہ سے محبّت کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے رسولؐ سے محبّت کی جائے لیکن اگر اللہ ہی سے تعلق ختم ہو جائے تو پھر رسولؐ سے محبّت کیوں کی جائے اور کس لئے کی جائے۔

(ج) جذبۂ عشقِ رسولؐ کے فنا ہو جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاد کا ولولہ ختم ہو گیا اور یہ کی آرزو دِل سے یکسر نکل گئی۔ بلکہ موت کے تصور سے رُوح پر لرزہ طاری ہونے لگا۔

(د) چونکہ کفر کو مُسلمان کی طرف سے ہر وقت جہاد کا خطرہ لاحق رہتا تھا اِس لئے اقبالؔ اُسے مبارکباد دیتے ہیں کہ اب بتوں کو مسلمانوں کی طرف سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں نے خود شیوۂ کفر اختیار کر لیا ہے۔

نوٹ:۔ اِس رباعی سے معلوم ہوا کہ جس مُسلمان کے دل میں جذبۂ جہاد کارفرما نہیں ہے وہ "لادین" ہے۔ جس طرح پچھلی رباعی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو مسلمان اللہ کے علاوہ غیر کو بھی حقیقی معنٰی میں موجود سمجھتا ہے وہ "نا مُسلمان" ہے۔

حدیثِ بندۂ مومن دل آویز
جگر پُر خوں، نفس روشن، نگہ تیز!
میسّر ہو کیسے دیدار اس کا
کہ ہے وہ رونقِ محفل کم آمیز!

حل لغات:۔ حدیثِ بندۂ مومن الخ حدیث حدث سے مشتق ہے اس کے لغوی معنٰی ہیں نئی بات، واقعہ، حادثہ، نو پیدا شدہ چیز، تاریخی واقعہ۔ اصطلاحی معنی ہیں آنحضرت صلعم کے ارشادات۔ یہاں مُراد ہے مومن کی داستانِ حیات یا شخصیت + جگرِ پُرخوں۔ کنایہ ہے عاشقانہ زندگی سے جو مومن کا طغرائے اِمتیاز ہے + نفسِ روشن۔ یہاں نفس سے گفتگو مُراد ہے۔ یعنی مومن کی گفتگو بہت معقول، دلپذیر اور حکمت سے لبریز ہوتی ہے + نگہ تیز۔ یہاں نگہ سے وہی مومنانہ فراست مُراد ہے جو فقر سے پیدا ہوتی ہے اور یہی اقبالؔ کا مقصود ہے۔ اقبالؔ نے نگاہ کو اکثر سمجھ بوجھ یا عقل و دانش کے مفہوم میں اِستعمال کیا ہے۔ نگاہ بمعنی دیکھنا تو مومن کی خصوصیت نہیں ہو سکتی۔ اور کس اور بتّس بھی دیکھ سکتے تھے + میسّر ہو کیسے دیدار الخ یہاں دیدار سے محض دیکھنا مراد نہیں ہے کیونکہ یہ تو ممکن ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ مومن "رونقِ محفل" ہے۔ جیسا کہ اگلے مصرع سے ہویدا ہے اِس لئے یہاں دیدار سے ارتباط اور اختلاط دوستانہ مراد ہو گی + کم آمیز۔ مومن کی شخصیت میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ رونقِ محفل ہونے کے باوجود کم آمیز ہوتا ہے۔ کم آمیز سے یہ مُراد ہے کہ مومن عورت، دولت اور جاگیر سے کوئی رابطۂ قلبی نہیں رکھتا یعنی علائق دنیوی میں گرفتار نہیں ہوتا۔ کم آمیز میں خصوصیت کے ساتھ یہ مفہوم پوشیدہ ہے کہ مومن عورتوں کی طرف بہت کم ملتفت ہوتا ہے۔ کیونکہ

اِنسان کی سب سے بڑی کمزوری، عورت ہی تو ہے۔ چنانچہ اقبالؔ نے اسی مفہوم کو ضربِ کلیم میں یوں بیان کیا ہے:-

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن
حُوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

مطلب:۔ اقبالؔ نے اِس رباعی میں مومن کی داستانِ حیات بلند کی ہے اور اس کی شخصیت کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ کہتے ہیں کہ مومن کی شخصیت بڑی دلکش ہوتی ہے۔ دلکشی کی تفصیل یہ ہے

(۱) وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور عاشقانہ زندگی بسر کرتا ہے۔

(۲) اِس کی گفتگو حکمت اور دانائی سے معمور ہوتی ہے، وہ اپنی زبان سے کوئی لغویات یا مہمل کلام ادا نہیں کرتا۔

(۳) اِس میں مومنانہ فراست پائی جاتی ہے۔

(۴) وہ رونقِ محفل ہوتا ہے یعنی اِس کی شخصیت میں ایسی کشش ہوتی ہے (اور یہ کشش روحانیت سے پیدا ہو جاتی ہے) کہ لوگ پروانوں کی طرح اِس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں یا وہ جس محفل میں جا نکلتا ہے اپنی روحانیت کی بنا پر لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔

(۵) وہ خود دُنیا اور دُنیا والوں سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ وہ رونقِ محفل ہوتا ہے یعنی تارک الدنیا نہیں ہوتا لوگوں سے ملتا جلتا ہے لیکن وہ کم آمیز ہوتا ہے یعنی علائقِ دنیوی سے کنارہ کش رہتا ہے، دُنیا سے دِل نہیں لگاتا۔

نوٹ:۔ بزرگانِ دین کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے اِس رباعی کی

حقانیت بالکل واضح ہو سکتی ہے۔ مثلاً سیدی حضرت نصیر الدین چراغِ دہلیؒ بلاشبہ رونقِ محفل تھے۔ ہزاروں اِنسانوں نے اِن کی ذات سے فیض حاصل کیا، دکن، بنگال گجرات اور پنجاب یعنی ہندوستان کے ہر گوشہ میں اُن کے مریدوں نے اِسلام کی شمع روشن کی لیکن وہ بذاتِ خود نہایت کم آمیز تھے۔ مدۃ العمر کسی دروازہ پر نہیں گئے، کسی سے کبھی کچھ طلب نہیں کیا!

یہ نکتہ اقبالؔ نے حضرت موصوف ہی سے تو سیکھا کہ "خودی از سوال ضعیف می گردد"

تمیزِ خار و گل سے آشکارا
نسیمِ صبح کی روشن ضمیری!
حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہے خوئے حریری!

مطلب:- اِس رباعی میں اقبالؔ نے قوانینِ فطرت سے صانعِ عالم کی ہستی پر استدلال کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ نسیمِ سحری اگرچہ ذی شعور اور صاحبِ ادراک نہیں ہے اِس کے باوجود وہ خار اور گُل میں امتیاز کرتی ہے۔ اِس سے ثابت ہوا کہ وہ کسی حکیم علیم اور قادرِ مطلق ہستی کی تابعِ فرمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف پھولوں کو شگفتہ کرتی ہے، کانٹوں کی سختی کو دور نہیں کرتی۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں ہر شئے اپنی ذات کے اقتضا کے مطابق ترقی کرتی ہے۔ پھول اور کانٹا دونوں ایک ہی شاخ پر لگتے ہیں لیکن کانٹے میں نرمی اور خوشبو پیدا نہیں ہو سکتی اور پھول میں سختی نہیں آسکتی۔ اِس سے ثابت ہوا کہ پسِ پردہ

کوئی مدبّر اور منتظم کائنات موجود ہے جو اِس نظام کو چلا رہا ہے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ پھول کی پتی میں نرمی (خوئے حریری) اور کانٹے میں سختی پیدا ہو جاتی، مادہ تو ادراک اور شعور سے معرّیٰ ہے۔ اگر کوئی علیم اور حکیم ہستی کارفرما نہ ہوتی تو یہ ممکن تھا کہ گلاب کے پودے میں چنبیلی کے پھول پیدا ہو جاتے قانونِ انتخابِ طبعی کی رو سے گلاب کا پودا جڑوں کے ذریعے سے وہی ذرات جذب کرتا ہے جن سے گلاب کا پھول بن سکتا ہے۔ آپ ایک تختہ میں گلاب چنبیلی اور بیلا تین پودے لگا دیجیے لیکن وہ تینوں وہی اجزا جذب کریں گے جو ان کے لئے ضروری ہیں۔ اِس سے ثابت ہوا کہ یہ کارخانہ کسی علیم و حکیم ہستی کے زیرِ انتظام چل رہا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب فطرت کے قوانین کے مطابق عمل میں آتا ہے۔ لیکن قانون کا وجود کسی قانون ساز کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔ قانون خود بخود نہیں بن سکتا۔ جس طرح دوربین یا گھڑی کا وجود صانع کے وجود پر شاہد ہے اُسی طرح قانون کا وجود، کسی مقنّن کے وجود پر دال ہے۔ غیر ذی شعور مادہ نہ قانون وضع کر سکتا ہے نہ اِس کو نافذ کر سکتا ہے۔ اکبرؔ الٰہ آبادی نے اسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے:-

منکرینِ روح کے جو یہ اہلِ غرور — اک امر پوچھنا ہے مجھیں ان سے ضرور
ہے فہم و خرد کا تم کو دعویٰ یہ کہو — پیدا ہوا مادہ میں کیونکر یہ شعور

میں یہ کہتا ہوں کہ یہ مادہ پرست اِس بات کا تو کیا جواب دیں گے وہ تو آج تک یہی نہ بتا سکے کہ مادہ کی ماہیت کیا ہے؟ دیمقراطیس کے زمانہ سے لے کر آج تک کوئی مادہ پرست مادّہ کی منطقی تعریف ہی پیش نہیں کر سکا ہے اِس کی وجہ یہ ہے کہ جو

نظر آتا ہے وہ مادہ نہیں ہے اور جو ان کی رائے میں مادّہ ہے وہ نظر نہیں آتا۔ جس طرح ریاضی والوں نے نقطہ کی ایک فرضی تعریف وضع کر لی ہے کہ نقطہ وہ ہے جو وضع (POSITION) تو رکھتا ہے۔ لیکن حجم یا جسامت (MAGNITUDE) نہیں رکھتا۔ حالانکہ ایسا نقطہ خارج میں کبھی موجود ہی نہیں ہو سکتا۔ اِسی طرح مادہ پرستوں نے مادّہ کی ایک فرضی تعریف بنالی ہے۔ کہ مادّہ ہیولیٰ اور صورت سے مرکب ہے۔ اور شعور اور حرکت اِس کی ذات میں داخل ہیں۔ اِس پر ہمارا یہ اعتراض ہے کہ

(۱) اگر مادّہ مرکب ہے تو حادث ہے۔ کیونکہ مرکب، ترکیب سے پہلے موجود نہیں ہو سکتا۔ اِس لئے وہ ازلی نہیں ہے ضرور اُسے کسی نے پیدا کیا ہے۔

(۲) جب ہمیں مادّہ کی ذات کا علم نہیں ہے تو ہم یہ کیسے تسلیم کر لیں کہ شعور یا حرکت اِس کی ذات میں داخل ہے۔ یہ تو دعویٰ ہے۔ نہ کہ تعریف۔ اِس پر کیا دلیل ہے کہ شعور، مادہ کی ذات میں داخل ہے؟ اِس کا جواب آج تک کسی مادّہ پرست نے نہیں دیا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ

(۱) فطرت، پھول کی حفاظت کرنی چاہتی ہے۔
(۲) اِس لئے نسیمِ صبح کانٹے میں خوئے حریری پیدا نہیں کرتی۔
(۳) یعنی خار و گل میں تمیز کرتی ہے۔
(۴) یہ تمیز اِس کی روشن ضمیری پر دال ہے۔
(۵) لیکن نسیمِ صبح، شعور سے عاری ہے۔
(۶) اِس لئے ثابت ہوا کہ اسے روشن ضمیری کسی صاحبِ شعور ہستی نے عطا کی ہے۔

(۷) اور وہ صاحبِ شعور ہستی مادّہ نہیں ہو سکتی۔
(۸) کیونکہ مادّہ، ذی شعور نہیں ہے۔
(۹) اِس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ کوئی ہستی ایسی ضرور موجود ہے جو صاحبِ شعور ہے۔
(۱۰) اُس ہستی کو ہم خدا کہتے ہیں۔

اِسی حقیقت کو اکبرؔ نے یوں بیان کیا ہے:-

صاف آئے گی نظر صانعِ عالم کی جھلک
صاف کچھ نہ رکھ آئینہ فطرت کے سوا

نہ کر ذکرِ فراق و آشنائی
کہ اصلِ زندگی ہے خود نمائی
نہ دریا کا زیاں ہے نے گہر کا
دلِ دریا سے گوہر کی جدائی!

مطلب:- اِس رباعی میں اقبالؔ نے اِس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ جویائے حقیقت یا سالکِ راہِ معرفت کو اِس بات پر افسوس کرنا مناسب نہیں ہے کہ روحِ اِنسانی خدا سے جدا ہو کر اُس دُنیا میں کیوں آگئی؟ نہ آتی نہ گرفتارِ بلا ہوتی۔ نہ فراق کی سختیاں سہتی۔ نہ آشنائی کی لذت سے محروم ہوتی۔ وَغَیْرَ ذٰلِکَ۔

کہتے ہیں کہ آشنائی اور جُدائی کا ذکر وہ لوگ کرتے ہیں جو خودی (روح) کی ماہیت سے ناواقف ہیں۔ خودی کی ذات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ظہور چاہتی ہے (اِسی جذبہ کو اقبالؔ نے خود نمائی سے تعبیر کیا ہے) لیکن خود نمائی کے لئے اصل سے جدائی ضروری ہے۔ اگر گلاب کا پھول، شاخ کے اندر ہے تو وہ اپنے آپ کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ اِسی طرح اگر خودی،

خدا کی آغوش میں پوشیدہ رہے تو اُسے وصال کی لذت تو حاصل ہو سکتی ہے لیکن وہ اپنی ہستی کو آشکارا نہیں کر سکتی۔ اِس لئے اگر خودی، خدا سے جُدا ہو کر زمان و مکان کی قید میں آجاتی ہے تو یہ اِس کے حق میں مضر نہیں ہے بلکہ مفید ہے۔ کیونکہ اِس طرح اُسے اپنی مخفی صلاحیتوں کو ظاہر کرنے کا موقع ملتا ہے۔

اگر موتی ہمیشہ صدف میں پوشیدہ رہے تو وہ اپنی خوبی دُنیا پر ظاہر نہیں کر سکتا۔ اِس لئے دریا سے اِس کی جدائی نہ اِس کے لئے موجب زیاں ہے نہ دریا کے لئے۔ اِسی طرح خودی اگر خدا سے جدا ہو کر دُنیا میں آئی ہے تو نہ خدا کا زیاں ہے نہ خودی کا۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ اصل زندگی، خود نمائی ہے۔ اور خود نمائی کے لئے اصلِ ذات سے جُدائی ضروری ہے۔

نوٹ:۔ لفظِ خود نمائی کو اقبالؒ نے لغوی معنی میں اِستعمال کیا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو ظاہر کرنے کی آرزو۔ اِس میں تکبر یا شیخی کا مفہوم داخل نہیں ہے۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

تمہید:۔ یہ اقبالؒ کی نہایت مقبول رباعیوں میں سے ہے۔ اور اس کی مقبولیت کا راز اس کے اندازِ بیان یا لطیف استفہام میں پوشیدہ ہے۔

دریا میں طوفان سے دِل میں شوقِ جہاد یا اِسلام کو دُنیا میں سربلند کرنے کا جذبہ مراد ہے۔ اور یہ چیز صرف عشقِ رسولؐ کی بدولت پیدا ہو سکتی ہے تیری خودی مسلمان

کیوں نہیں ہے۔ یعنی تو شریعتِ اِسلامیہ کی اِطاعت کیوں نہیں کرتا۔ واضح ہو کہ فلسفۂ اقبالؒ کی رُو سے محض ارکانِ ظاہری پر عمل کرنے سے خودی مُسلمان نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ایک شخص نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، زکوٰۃ دیتا ہے، حج بھی کرتا ہے تو دُنیا کی نظر میں وہ مُسلمان ہے۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ اِس کی خودی ابھی تک مُسلمان نہ ہوئی ہو۔ ہاں اگر اِن ارکانِ ظاہری کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ اُس نے اتباعِ رسولؐ (کامل اطاعت) کی بدولت نفسِ امّارہ کو بھی مغلوب کر لیا ہو تو اِس کی خودی مسلمان ہو سکتی ہے۔

جب تک مُسلمان نفسِ امّارہ کو مغلوب نہ کرے، اس وقت تک اُس کی خودی مسلمان نہیں ہو سکتی۔ اور نفسِ امّارہ، صحبتِ مُرشد کے بغیر مغلوب نہیں ہو سکتا۔ مُرشد کے زیرِ تربیت مُسلمان اپنے اختیار اور اپنی ہمت سے کام لے کر نفس کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ تب جا کر یہ اِس کے قابو میں آتا ہے۔ اِس بات کی تصدیق صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے بخوبی ہو سکتی ہے۔

(١) اِن حضراتؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہ کر نفسِ امّارہ کو مغلوب کیا تھا اور بعض تو اِس اکتسابِ فیض کے لئے، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپؐ کے قدموں ہی میں آپڑے تھے۔ تاریخِ اِسلام میں اِن کا لقب "اصحابِ صُفّہ" ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنی خودی کو مُسلمان بنا لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (١٨: ٢٨) یعنی اے رسولؐ! جو لوگ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے

کے لئے سب کچھ چھوڑ کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے ہیں اور صبح و شام اپنے رب کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں آپؐ اُن عاشقانِ خدا یا طالبانِ حق کو اپنی صحبت سے مستفید کرتے رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپؐ ہمارے اِن مخلص بندوں سے قطعِ نظر کر کے کفار کی طرف متوجہ ہو جائیں، اِس خیال سے کہ اِن کے مُسلمان ہو جانے سے اِسلام کو ترقی یا دُنیاوی شان و شوکت حاصل ہو جائے گی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آپؐ اپنی نشست و برخاست اُن لوگوں کے ساتھ رکھیں (اِن کو اپنی صحبت سے فائدہ پہنچائیں) جو ہماری خوشنودی کے طالب ہیں اور اس غرض سے اپنے نفس کے خلاف جہاد میں مصروف ہیں۔

(٢) حضورؐ کی صحبت سے صحابۂ کرامؓ نفسِ امّارہ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے رُوحانی طاقت حاصل کرتے تھے۔ اور طاقت، ہمت اور حوصلہ اور ولولہ حاصل کرنے کے بعد پھر اپنی ذاتی ہمت اور ذاتی اختیار سے کام لیتے تھے اور نفسِ امّارہ کو مغلوب کرتے تھے۔

(٣) جب نفسِ امّارہ مغلوب ہو جاتا تھا تو اِن کی خودی مُسلمان ہو جاتی تھی۔ واضح ہو کہ نفسِ امّارہ پانچ دشمنوں کے مجموعہ کا نام ہے اور یہ پانچوں دشمن اندر ہی ہیں جیسا کہ حضورؐ نے اِرشاد فرمایا۔ عَدُوُّكَ فِي جَنْبِكَ یعنی تیرا دشمن تیرے پہلو میں پوشیدہ ہے۔ اِن دشمنوں کے نام یہ ہیں۔

(١) شہوت (ب) غضب (ج) حُبِّ جاہ و مال (د) حرص و طمع (ہ) خود بینی جس کی دو صورتیں ہیں (١) عُجب (٢) تکبیر

میں نے اِس نکتہ کی وضاحت اِس لئے کی ہے کہ آج کل ہمارے مُلک میں

بعض مُسلمان حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اِس لئے اِن کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ پاکستان کے مسلمانوں کی خودی کو مُسلمان بنا دیں۔ اِس کے بعد اِن کی جدوجہد انشاءاللہ بار آور ہو جائے گی۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے عربوں کی خودی کو مُسلمان بنایا تھا۔ اِس کے بعد حکومتِ الٰہیہ قائم فرمائی تھی۔ بلکہ میرا تو ایمان ہے کہ خودی کے مُسلمان ہو جانے کے بعد کوئی مُسلمان ایک لمحہ کے لئے بھی غیر قرآنی حکومت کو برداشت نہیں کر سکتا۔

اِس لئے جو لوگ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے داعی ہیں اُنھیں لازم ہے کہ صحبتِ مُرشد کی بدولت پہلے اپنی خودی کو مُسلمان بنائیں اِس کے بعد دوسروں کو اِسی مسلک کی طرف دعوت دیں۔ آخری مرحلہ یعنی جہاد میں کامیابی کے لئے پہلے مرحلہ یعنی جہاد بالنفس میں کامیابی اشد ضروری ہے۔ جو قوم ایٹم بم کی سرحد پر فوجوں کے اجتماع کی خبر سُن کر اپنے شہر سے بھاگنا شروع کر دیتی ہے وہ حکومتِ الٰہیہ کیسے قائم کر سکتی ہے؟ اِس کے لئے تو ساری دُنیا کے خلاف صف آرا ہونا پڑے گا۔ کیا امریکہ اور انگلستان اِس بات کو گوارا کر سکیں گے کہ پاکستان میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی حکومت قائم ہو جائے؟ آخر امریکہ پاگل تو نہیں ہے جو ہمیں یوں فراخ دلی کے ساتھ مالی اِمداد دے رہا ہے۔ اگر اس کا ارادہ اِس مُلک میں اپنی حکومت قائم کرنے کا نہیں ہے تو وہ ہم پر اس قدر مہربان کیوں ہے؟ سردست غور کے لئے اتنا ہی اشارہ کافی ہے۔

اِس رباعی میں آخری تشریح طلب ترکیب "تقدیرِ یزداں" ہے۔ جو رباعی کی جان ہے۔ بلکہ اقبالؒ کے فلسفہ میں بڑی اہمیت اور نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

واضح ہو کہ تقدیر کے کئی معنی ہیں:

(۱) اِس کے مشہور معنی تو یہ ہیں کہ خدا نے ہر انسان کی پیدائش سے پہلے اس کی تقدیر اس کی پیشانی میں لکھ دی ہے۔ یعنی خدا نے پہلے سے طے کر دیا ہے کہ فلاں شخص اس نہج پر زندگی بسر کرے گا۔ اِس لئے اِنسان اپنی تقدیر سے یعنی خدا کے فیصلوں سے (تقدیرِ یزداں) سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتا۔ اِس لئے اصلاحِ حالات کی خاطر ہر قسم کی جدوجہد بے کار ہے۔ اور ہر قسم کی کوشش بے سود ہے۔ کیونکہ انسان خدائی فیصلوں (تقدیرِ یزداں) کو کسی طرح نہیں بدل سکتا۔

واضح ہو کہ اقبال تقدیر کے اِس مفہوم کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ انسان مجبور ہے لیکن اگر وہ اپنی خودی کو مُسلمان بنا لے تو مقامِ جبر سے مرتبۂ اختیار پر فائز ہو سکتا ہے۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

اقبال کہتے ہیں کہ بیشک اِنسان مجبور ہے لیکن اگر مشیتِ ایزدی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ اگر وہ اپنی خودی کو مُسلمان بنا لے یعنی شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کر لے، اگر وہ اطاعتِ رسولؐ میں اپنے آپ کو فنا کر دے تو اس کی مجبوری میں مختاری کا رنگ پیدا ہو جائے گا۔

جبرِ خالدؓ عالمے برہم کند
جبرِ ما بیخ و بُنِ ما بر کند

(۲) تقدیر کے لغوی اور قرآنی معنی ہیں اندازہ کرنا۔ چند آیات درج کرتا ہوں۔

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (۴۹:۵۴)
ہم نے ہر شئے کو اندازہ کے ساتھ پیدا کیا ہے
خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا

اُس نے تمام چیزیں پیدا کیں پھر ہر چیز کے لئے (اس کی حالت اور ضروریات کے مطابق) ایک خاص اندازہ معین کر دیا (جس سے وہ انحراف نہیں کر سکتی)

قرآنی اصطلاح میں تقدیر اللہ کے قانون کو کہتے ہیں۔ سائنس میں اِسی قانون یا قوانین کے مجموعہ کو نیچر یا لاز آف نیچر کہتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا قانون تکوینی جس کے مطابق دُنیا کا یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ مثلاً افیون کی تقدیر یہ ہے کہ اگر وہ طبیب کے مشورہ سے ایک خاص مقدار میں کھائی جائے گی تو بعض امراض کا ازالہ کر دے گی۔ لیکن وہی افیون اگر زیادہ مقدار میں کھا لی جائے گی تو پیامِ موت بن جائے گی۔ افیون کی یہ تقدیر، دراصل خدا کی مقرر اور معین کردہ ہے۔

تقدیر کا دوسرا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے ایک خاص حالت معین فرما دی ہے۔ ہر شئے اُس حالت کے اندر رہتی ہے۔ بلکہ رہنے پر مجبور ہے۔ بہنا یا سیلان پانی کی تقدیر ہے۔ حرکت کرنا ہوا کی تقدیر ہے۔ جلنا اور جلانا آگ کی تقدیر ہے۔ نیچے کی طرف جانا مٹی کی تقدیر ہے۔ پانی میں تیرنا مچھلی کی تقدیر ہے، ہوا میں اُڑنا کبوتر کی تقدیر ہے۔

غرض کہ اللہ تعالیٰ نے جس مخلوق کی جیسی تقدیر معین کر دی ہے یعنی زندگی کا جو اندازہ مقرر کر دیا ہے اِس کے خلاف نہیں ہو سکتا

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۳۶/۳۸) اور

۱۵۰

واضح ہو کہ تقدیر کے کئی معنی ہیں:

(۱) اِس کے مشہور معنی تو یہ ہیں کہ خدا نے ہر انسان کی پیدائش سے پہلے اس کی تقدیر اس کی پیشانی میں لکھ دی ہے۔ یعنی خدا نے پہلے سے طے کر دیا ہے کہ فلاں شخص اس نہج پر زندگی بسر کرے گا۔ اِس لئے اِنسان اپنی تقدیر سے یعنی خدا کے فیصلوں سے (تقدیرِ یزداں) سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتا۔ اِس لئے اصلاحِ حالات کی خاطر ہر قسم کی جدوجہد بے کار ہے۔ اور ہر قسم کی کوشش بے سود ہے۔ کیونکہ انسان خدائی فیصلوں (تقدیرِ یزداں) کو کسی طرح نہیں بدل سکتا۔

واضح ہو کہ اقبال تقدیر کے اِس مفہوم کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ انسان مجبور ہے لیکن اگر وہ اپنی خودی کو مُسلمان بنا لے تو مقامِ جبر سے مرتبۂ اختیار پر فائز ہو سکتا ہے۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

اقبال کہتے ہیں کہ بیشک اِنسان مجبور ہے لیکن اگر مشیتِ ایزدی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ اگر وہ اپنی خودی کو مُسلمان بنا لے یعنی شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کر لے، اگر وہ اطاعتِ رسولؐ میں اپنے آپ کو فنا کر دے تو اس کی مجبوری میں مختاری کا رنگ پیدا ہو جائے گا۔

جبرِ خالدؓ عالمے برہم کند
جبرِ ما بیخ و بُنِ ما بر کند

(۲) تقدیر کے لغوی اور قرآنی معنی ہیں اندازہ کرنا۔ چند آیات درج کرتا ہوں۔

۱۵۱

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (۴۹:۵۴)
ہم نے ہر شئے کو اندازہ کے ساتھ پیدا کیا ہے
خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا

اُس نے تمام چیزیں پیدا کیں پھر ہر چیز کے لئے (اس کی حالت اور ضروریات کے مطابق) ایک خاص اندازہ معین کر دیا (جس سے وہ انحراف نہیں کر سکتی)

قرآنی اصطلاح میں تقدیر اللہ کے قانون کو کہتے ہیں۔ سائنس میں اِسی قانون یا قوانین کے مجموعہ کو نیچر یا لاز آف نیچر کہتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا قانون تکوینی جس کے مطابق دُنیا کا یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ مثلاً افیون کی تقدیر یہ ہے کہ اگر وہ طبیب کے مشورہ سے ایک خاص مقدار میں کھائی جائے گی تو بعض امراض کا ازالہ کر دے گی۔ لیکن وہی افیون اگر زیادہ مقدار میں کھا لی جائے گی تو پیامِ موت بن جائے گی۔ افیون کی یہ تقدیر، دراصل خدا کی مقرر اور معین کردہ ہے۔

تقدیر کا دوسرا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے ایک خاص حالت معین فرما دی ہے۔ ہر شئے اُس حالت کے اندر رہتی ہے۔ بلکہ رہنے پر مجبور ہے۔ بہنا یا سیلان پانی کی تقدیر ہے۔ حرکت کرنا ہوا کی تقدیر ہے۔ جلنا اور جلانا آگ کی تقدیر ہے۔ نیچے کی طرف جانا مٹی کی تقدیر ہے۔ پانی میں تیرنا مچھلی کی تقدیر ہے، ہوا میں اُڑنا کبوتر کی تقدیر ہے۔

غرض کہ اللہ تعالیٰ نے جس مخلوق کی جیسی تقدیر معین کر دی ہے یعنی زندگی کا جو اندازہ مقرر کر دیا ہے اِس کے خلاف نہیں ہو سکتا

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۳۶/۳۸) اور

یہ نہیں کہ فیصلہ ہو گیا ہے کہ زید اشقی ہے اور بکر سعید (اگر ایسا ہو تو پھر بعثتِ انبیاء کا سلسلہ ہی لغو قرار پائے گا) بلکہ خدا ہر وقت مدد کرنے اور راہ دکھانے کے لئے تیار ہے۔ خدا کے خزانوں میں کسی قسم کی کمی نہیں ہے، اس کی برکات تولا انتہا ہیں، اگر تمہیں ایک معاملہ میں ناکامی ہوئی ہے تو ہمت مت ہارو دوسرا طریق اختیار کرو اس میں بھی کامیابی نہ ہو تو ترقی کا تیسرا راستہ اختیار کرو۔

تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست
زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہا است

مثال درکار ہو تو دنیا کے سب سے بڑے انسان بلکہ کامیاب ترین انسان کی زندگی کا مطالعہ کرو۔

(۱) مکہ میں کامیابی نہ ہوئی تو طائف جا کر کوشش فرمائی۔

(۲) وہاں بھی کامیابی نہیں ہوئی تو یثرب تشریف لے گئے۔

چنانچہ وہاں اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی۔ اقبالؔ نے جاوید نامہ[1] میں اس موضوع پر اپنے خیالات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ میں اس جگہ پوری بحث تو نہیں لکھ سکتا ہاں ایک شعر درج کئے دیتا ہوں جو ان کے فلسفہ کی کلید ہے۔

اہلِ حق تقدیرِ خودی در یافتند	نکتۂ تقدیر را نشناختند
رمز باریکش بحرفے مضمر است	تو اگر دیگر شوی او دیگر است

اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسانوں نے تقدیر کے مسئلہ کو صحیح طریق پر نہ سمجھنے کی وجہ

[1] اگر اللہ نے توفیق عطا فرمائی تو اس عظیم الشان کتاب کی شرح بھی ہدیۂ شائقین کروں گا۔

سے اپنی خودی کی مخفی صلاحیتوں کو ضائع کر دیا۔ یعنی تقدیر کے غلط مفہوم نے ان کی قوتِ عمل کو مُردہ کر دیا۔ میں تقدیر کا صحیح مفہوم ایک جملہ میں سمجھائے دیتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اگر انسان اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لے تو اس کی تقدیر بھی بدل جائے گی۔ بالفاظ واضح تر اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان نافرمانی کا شیوہ ترک کر کے اللہ کا فرمانبردار بن جائے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو اپنے فضل و کرم کا مورد بنا لے گا۔

اس تمہید کے بعد اب اس رباعی کا مطلب لکھتا ہوں:-

کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو کیوں اپنی بدقسمتی کا شکوہ کرتا ہے؟ یہ شکوہ محض اس لئے ہے کہ تو تقدیر کے مفہوم سے آگاہ نہیں ہے۔ سُن! اگر تو اپنی خودی کو مسلمان بنا لے یعنی اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں فنا کر دے۔ یعنی کامل فرمانبرداری کا طریق اختیار کر لے تو میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تو خود "تقدیرِ یزداں" بن جائے گا۔ یعنی جب تو اُس کا ہو جائے گا تو وہ تیرا ہو جائے گا ؎

در رضایش مرضیِ حق گم شود
ایں سخن کے باورِ مردم شود

یعنی جب بندہ اپنی مرضی اللہ کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے تو اللہ خوش ہو کر اپنی مرضی اس کی مرضی کے مطابق کر دیتا ہے لیکن عوام الناس اس نکتہ کو سمجھ نہیں سکتے اور جب تو خود "تقدیرِ یزداں" بن جائے گا تو پھر تیرے دریا میں طوفان برپا ہو جائے گا۔ یعنی تو جس کام کا ارادہ کرے گا خدا کی تائید تیرے شاملِ حال ہو گی۔

اپنے اسلاف کی زندگیوں کا مطالعہ کر۔ چونکہ انھوں نے اپنی خودی کو مسلمان بنا لیا تھا۔ اس لئے ہر مہم میں تائیدِ ایزدی اُن کے شاملِ حال رہتی تھی اور

وہ جس طرف رُخ کرتے تھے، کامیابی اُن کے قدم چومتی تھی۔ اسی حقیقت کو اقبالؔ نے اس شعر میں بیان کیا ہے:-

تھی نہ تقدیر" ہے آج اُن کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

اب تاریخ سے ایک مثال دے کر اس نکتہ کو واضح کرتا ہوں:-

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت کر کے اپنی مرضی کو اس کی مرضی میں فنا کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی آرزو کو اپنی مشیت بنا لیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب آپ کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ بیت المقدس کے بجائے کعبہ کو قبلہ مقرر کر دے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی رضا کو اپنی تقدیر بنا دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط (۲: ۱۴۴) بیشک ہم آپ کے منہ کا آسمان کی طرف پھرنا دیکھ رہے ہیں، اس لئے ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے۔ جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔ یعنی جو آپ کی مرضی ہے وہی ہماری بھی مرضی ہے۔

غالباً اسی آیتِ مبارک پر غور کرنے کے بعد یہ مضمون اقبالؔ کے دماغ میں پیدا ہوا ہو گا:-

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

"بنیادی تصور" اس رباعی کا یہ ہے کہ اگر بندہ پہلے اپنی مرضی خدا کی مرضی میں گم کر دے تو پھر وہ خود "تقدیرِ یزداں" بن جائے گا۔ یعنی یہ کائنات اُس کی مطیع ہو جائے گی۔

خرد دیکھے اگر دل کی نگہ سے
جہاں روشن ہے نورِ لا اِلٰہ سے
فقط اک گردشِ شام و سحر ہے
اگر دیکھیں فروغِ مہر و مہ سے

مطلب:- اس رباعی میں اقبالؔ نے اُن دو مشہور زاویائے نگاہ یا مکاتبِ خیال کی طرف اشارہ کیا ہے جو ابتدائے آفرینش سے تا ایں دم کار فرما ہیں اور گمان غالب یہی ہے کہ قیامت تک اُن کی حکومت قائم رہے گی۔

چونکہ یہ دونوں نقطۂ نظر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لئے ان میں نہ تو مصالحت ہو سکتی ہے۔ ایک کا نام ہے روحانیت یا تصوریت (IDEALISM) اور دوسرے کا نام ہے مادیت (MATERIALISM) یا تقلیدِ طبیعۃ (NATURALISM) آخر الذکر زاویۂ نگاہ یا مسلکِ زندگی عقل سے پیدا ہوتا ہے اوّل الذکر عشق کی بدولت ظہور میں آتا ہے۔

چونکہ عقل اور عشق ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مادہ پرست (اشتراکی) اور خدا پرست (مسلمان) ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں اتحاد نہیں ہو سکتا۔

سیاہی اور سفیدی ایک وقت میں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔ سیاہی ہمیشہ سفیدی کو مٹانے کی کوشش کرتی ہے اسی طرح مادہ پرستی ہمیشہ خدا پرستی کا خاتمہ کرنے میں ساعی رہتی ہے۔

ایک کی برتری دوسرے پر اس لئے ثابت نہیں ہو سکتی کہ

(۱) مادہ پرست عقل کے علاوہ یا اُس سے بالاتر کسی طاقت یا ذریعۂ حصول کو تسلیم کرتا اور خدا حواس و عقل کی دسترس سے بالاتر ہے اِس لئے مادہ پرست اُسے کس طرح تسلیم کر سکتا ہے؟

مادہ پرست یہ کہتا ہے کہ خدا کا وجود عقل سے ثابت کرو۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ تو عقل کی رسائی سے وراء الورا ہے۔ عقلِ انسانی دلائل و شواہد و قرائن کی بنا پر اس مقام تک پہنچ جاتی ہے کہ اِس کائنات کا کوئی خالق یا صانع ہونا چاہیئے لیکن وہ اِس منزل تک نہیں پہنچ سکتی کہ واقعی وہ خالق یا صانع موجود ہے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ وہ ہستی باری کا ظن غالب تو پیدا کر دیتی ہے لیکن یقین پیدا نہیں کر سکتی۔ اِسی لئے اقبال نے یہ کہا۔

زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل
بیا کہ عشقِ مسلماں و عقل زناری است

اکبر الٰہ آبادی نے اِسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے۔

ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

مادہ پرست یہ کہتا ہے کہ جو چیز عقل سے ثابت نہ ہو یا سمجھ میں نہ آئے اُسے تسلیم نہیں کر سکتا۔ خدا پرست اِس کے جواب میں یہ کہتا ہے کہ:۔

تواں در بلاغت بہ سحباں رسید
نہ در کُنہ بیچونِ سبحاں رسید

تو ناظرین خود فیصلہ کر لیں کہ خدا پرست اور مادہ پرست میں مصالحت یا مفاہمت

کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ مادہ پرست کہتا ہے عقلی دلیل لاؤ بلکہ مشاہدہ کراؤ تو ایمان لاؤں گا۔ خدا پرست کہتا ہے خدا کا وجود عقل سے نہیں بلکہ وجدان سے ثابت ہو سکتا ہے۔

مادہ پرست یہ جواب دیتا ہے کہ میں تمہارے وجدان (عشق) کو تسلیم نہیں کر سکتا جسے تم عشق کہتے ہو، میں اُسے دماغ کا خلل، قرار دیتا ہوں۔

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

خدا پرست، کہتا ہے مرشد کی صحبت سے قلب (رُوح) مصفّٰی ہو جاتا ہے تو آدمی خدا کو دیکھ لیتا ہے اور دیدار کا مرتبہ شنید سے بڑھ کر ہے۔ مادہ پرست یہ جواب دیتا ہے کہ میں قلب کے وجود ہی کا قائل نہیں ہوں اِس لئے اس کے تصفیہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اندریں حالات خدا پرست، مادہ پرست پر کیسے غالب آسکتا ہے۔ اسی طرح خدا پرست، مادہ پرست کے دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتا کہ یہ کائنات ذرّاتِ مادّی کے امتزاج کا نتیجہ ہے کیونکہ ذرّات میں شعور نہیں ہے تو غیر ذی شعور مادہ سے ذی شعور انسان کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ خلاصۂ بحث یہ ہے کہ دونوں کی راہیں، حقیقت رسی کے ذرائع مختلف ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ذرائع یا اُن کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے تو فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ آج تک فیصلہ نہ ہو سکا اور نہ کبھی ہو سکے گا۔

راز ایں پردہ نہاں است و نہاں خواہد بود

یہ وضاحت میں نے اِس لئے کی ہے کہ ناظرین پر حقیقت واضح ہو جائے کہ کوئی شخص اِن گروہوں میں نہ مصالحت کرا سکتا ہے اور نہ از روئے عقل ایک کی دوسرے پر فضیلت ثابت کر سکتا ہے۔ اِسی لئے اقبال نے دونوں، مذہبوں کا ذکر تو کر دیا لیکن خود کوئی فیصلہ نہیں کیا لیکن صرف یہ کہہ دیا کہ

(۸) اگر دل کی نگاہ سے دیکھو تو دُنیا لا اِلٰہ کے نور سے روشن ہے۔

(۹) اور اگر عقل کی نگاہ سے دیکھو تو دُنیا مہر و ماہ کے نور سے روشن ہے اب جسے جو مسلک پسند آئے اختیار کر لے۔

اِس ضروری تمہید کے بعد اب میں تصوریت اور مادیت کی تعریف لکھتا ہوں۔

(۱) تصوریت کی تعلیم یہ ہے کہ یہ کائنات تمام بکمال از اوّل تا آخر کسی نفسِ مدرک یا ذہن یا رُوح کا ظہور ہے یا اُسی کی خارجی شکل ہے یعنی کائنات کی حقیقت روحانی ہے۔

(ب) مادیت کی تعریف یہ ہے کہ یہ کائنات تمام و کمال از اوّل تا آخر مادہ کی حرکات و اشکال مختلفہ کا ظہور ہے۔ اور تمام اشیائے کائنات ذرات مادّی کے امتزاج کا نتیجہ ہیں۔ یعنی کائنات کی حقیقت مادّی ہے (اسی کو مذہبِ طبیعی (NATURALISM) بھی کہتے ہیں۔

واضح ہو کہ فارس میں افلاطون مسلکِ تصوریت کا بہت بڑا حامی گذرا ہے۔ چنانچہ اس کے فلسفیانہ نظام میں ما الحقیقت = (REALITY) مظاہر کائنات کے پس پردہ پوشیدہ ہے۔ اِن مظاہر میں حقیقت کی جھلک تو نظر آسکتی ہے۔ لیکن وہ حقیقت کو بکلی ظاہر نہیں کر سکتے اگر کسی کو حقیقت تک پہنچنے کی آرزو ہو۔ تو اس کا ذریعہ عقل نہیں ہے (کیونکہ وہ محتاجِ حواس ہے۔ اِس لئے ناقص اور محدود ہے) بلکہ دل ہے اِس لئے طالبِ حقیقت کو لازم ہے کہ وہ اپنی رُوح کا تزکیہ اور تجلیہ کرے تاکہ وہ ازلی حقائق کا (IDEAS) کا ادراک کر سکے۔

متاخرین میں ہیگل اِس مسلک کا نامور وکیل گذرا ہے۔ چنانچہ جدید فلسفہ کی تاریخ میں، اِس کا نظام فکر یعنی تصوریتِ مطلقہ (ABSOLUTE IDEALISM) خاص

مقام رکھتا ہے۔ لیکن اُس نے اپنے بنیادی تصورات کو ایسے مبہم طریق پر پیش کیا ہے کہ اقبال کو یہ کہنا پڑا اور واقعی اُنہوں نے ٹھیک کہا ہے۔

ہیگل کا صدف گُہر سے خالی
ہے اِس کا طلسم سب خیالی

مثلاً اِس کے فلسفہ کا مطالعہ کرنے کے بعد آدمی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ

(۱) ہیگل کا پیش کردہ خدا جسے وہ المطلق (THE ABSOLUTE) قرار دیتا ہے۔ شعور ذات کا حامل ہے یا نہیں۔ ابہام کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہیگل یہ کہتا ہے کہ المطلق اپنا شعور، افراد ہی میں ظاہر ہو کر حاصل کر سکتا ہے یا اسی دعویٰ سے نتیجہ نکل سکتا ہے کہ المطلق، بذاتِ خود شعور سے عاری ہے۔

(۲) وہ کہتا ہے کہ خدا کا ظہور ہر شخص میں ہو رہا ہے تو سوال یہ ہے کہ پھر یسوع مسیحؑ خدائے مجسم کیسے ہو سکتا ہے؟ اِس اشکال کا باعث یہ ہے کہ ہیگل یہی کہتا ہے کہ خدا کا ظہور، یسوع مسیح میں ہوا ہے یعنی وہ خدائے مجسم ہے۔ میری رائے میں یہ بات ہیگل نے محض حکومت کو خوش کرنے کے لئے لکھ دی ہے کیونکہ الوہیتِ مسیح کا انکار کر کے وہ از رُوئے قانونِ مُلکی پروفیسر نہیں رہ سکتا تھا۔

(۳) آیا افراد بھی غیر فانی ہیں یا صرف ذہنِ مطلق (MIND TH E ABSOLUTE) ہی غیر فانی ہے۔

اسی طرح بہت سے مسائل ہیں جن کو ہیگل نے یا تو تشنۂ تفصیل چھوڑ دیا۔ یا اُن کو ایسے مبہم انداز میں بیان کیا کہ خدا پرست اور مادہ پرست دونوں اِس کی پیش کردہ تصریحات سے اپنا اپنا مطلب نکال سکتے ہیں۔ چنانچہ کارل مارکس نے اپنے

ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نظامِ فکر کی بُنیاد ہیگل ہی کے فلسفہ پر رکھی ہے۔

اِس تمہید کے بعد اب میں رُباعی کا مطلب لکھتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ اگر انسان اس کائنات کا مشاہدہ دل کی نگاہ سے کرے تو یہ حقیقت اس پر منکشف ہو جائے گی کہ کائنات کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ یعنی بذاتِ خود وہ کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی بلکہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے نُور سے روشن ہے۔ یعنی اسماء و صفاتِ الٰہیہ کی بدولت قائم ہے یعنی اِن کا پرتو ہے۔ لفظ "روشن" کے دو نوں معنی صحیح ہیں۔

(۱) روشن بمعنی موجود یعنی یہ جہان، اللہ کے نور سے موجود نظر آتا ہے۔

(۲) روشن بمعنی ظاہر یعنی اس جہان کی ہر شئے میں اللہ ہی کا ظہور ہے گویا لفظ روشن سے وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود دونوں مفہوم نکل سکتے ہیں۔ اقبال نے "نور لا اللہ" کی ترکیب قرآنِ حکیم کی اِس آیت سے مستعار لی ہے:-

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِیْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّ لَا غَرْبِیَّةٍ ۙ یَّكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۙ

اللہ آسمانوں اور زمین کا نُور ہے (یعنی اِن کا وجود اور ظہور اُسی کے نور کی بدولت ہوا ہے) اِس کے نُور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہو اور اُس میں ایک چراغ ہو اور وہ چراغ ایک شیشہ میں ہو اور وہ شیشہ ایسا چمکیلا ہو جیسے کوئی چمکیلا ستارہ اور اِس میں ایک مبارک درخت کا تیل جل رہا ہو یعنی زیتون کا جو نہ شرقی ہے نہ غربی ہے

اِس کا تیل چونکہ بہت صاف ہے اِس لئے قریب ہے کہ آگ دکھانے کے بغیر آپ ہی آپ جل اُٹھے غرض ایک نُور نہیں ہے بلکہ نُور پر نُور ہے یعنی ہر طرف نُور ہی کا جلوہ ہے۔ اللہ اپنے نُور سے جس کو چاہے راہ دکھاتا ہے اور اللہ یہ مثالیں لوگوں کو سمجھانے کے لئے بیان کرتا ہے اور آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ ہر شئے کی حقیقت سے واقف ہے۔ یعنی اللہ جانتا ہے کہ کائنات میں اِس کے نُور کے سوا اور کچھ موجود نہیں ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ کسی شئے کی کوئی حقیقت نہیں ہے جو کچھ ہے اُسی کی صفات کا کرشمہ ہے۔"

میں اِس آیت کی تشریح تو اِس جگہ درج نہیں کر سکتا صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ شیشہ سے ذاتِ محمدی مُراد ہے۔ جو باعثِ تخلیقِ کائنات ہے یعنی خالق اور مخلوقات کے درمیان واسطہ ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسلکِ عشق کی رُو سے کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ تمام اشیائے کائنات میں اُسی کا نُور جلوہ فرما ہے اور وہی ایک وجودِ حقیقی ہے جو کہیں گُل کی خوشبو میں ظاہر ہو رہا ہے کہیں بلبل کی آواز میں ہویدا ہو رہا ہے۔ وہی وجودِ واحدِ حقیقی ہے جو کہیں تاروں میں چمک رہا ہے، کہیں انسانوں میں مسکرا رہا ہے۔ غرض کہ وہی ایک وجود ہے جو لاکھوں صورتوں میں اپنا جلوہ دکھا رہا ہے۔ اِس کے علاوہ اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ یہی مفہوم ہے لَا موجود اِلَّا اللّٰہ کا جس کے ایک اولیٰ مبلّغ حضرت اقبال بھی ہیں۔

لیکن اِسی کائنات کو عقل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ کائنات نُورِ ایزدی کے بجائے آفتاب و ماہتاب کے نُور سے روشن ہے۔ یا بالفاظِ دیگر "پیچ تو گردشِ شام و سحر" ہے یعنی یہ کائنات اُن قوانینِ فطرت کی پابند ہے۔ جو مادہ کی بدولت ظہور میں آئے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ

(۱) مسلکِ عشق کی رُو سے کائنات میں اللہ کے علاوہ اور کسی کا وجود نہیں ہے۔

(۲) مذہبِ عقل کی رُو سے کائنات میں مادّہ کے سوا اور کوئی شئے موجود نہیں ہے۔

خدا پرست کہتا ہے صرف رُوح جلوہ گر ہے مادّہ بھی رُوحانی ہے۔ مادّہ پرست کہتا ہے صرف مادّہ کارفرما ہے رُوح بھی مادّی ہے۔

فلسفہ کی ابتدا سے لے کر آج تک خدا پرستوں اور مادّہ پرستوں کے درمیان اِسی مسئلہ پر جدال و نزاع ہو رہی ہے کہ اِس کائنات کا خالق کون ہے؟ لیکن ہنوز روزِ اوّل ہی ہے۔ غالباً اِسی لئے حافظ شیرازی نے ہمیں یہ مشورہ دیا ہے۔

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

کبھی دریا سے مثلِ موج اُبھر کر
کبھی دریا کے سینے میں اُتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گذر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

تمہید:- اِس رُباعی میں اقبال نے مقامِ خودی کو ظاہر کرنے کے تین مختلف النوع طریقے بیان کئے ہیں۔ دریا سے کائنات یا عالمِ شہادت مُراد ہے۔

پہلا طریقہ یہ ہے کہ عالمِ مادّی یا کائنات کے عناصر اور اُن کی قوتوں کو مسخّر کرو۔ اور اُن کو اپنے مقاصدِ عالیہ کی تکمیل کے لئے اِستعمال کرو یعنی مادّی اعتبار سے ترقی کرو۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اِس کائنات کے مختلف باطنی پہلوؤں پر غور و فکر کرو اور

ہر شئے کی ماہیت دریافت کرو۔ یعنی کائنات کے دل کو چیر کر دیکھو کہ اِس کے اندر کیا کیا چیزیں پوشیدہ ہیں۔ یعنی عقلی اعتبار سے ترقی کرو۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اِس کائنات کی حدود سے بالاتر ہو کر عالمِ روحانیت کی سیر کرو اور اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرو یعنی مادیات سے بالاتر ہو جاؤ۔ دریا سے مثلِ موج اُبھرنا اور کبھی اُس کے سینہ میں اُترنا اِن دونوں باتوں کا مطلب ہے آفاق (قوائے فطرت) کا مطالعہ اور اس کی تسخیر۔ دریا کے ساحل سے گذرنا اِس سے مُراد ہے۔ خود اپنی ذات میں غور کرنا جو کائناتِ مادّی سے جُدا گانہ ایک رُوحانی حقیقت ہے گویا خودی کو فاش کرنے کے یہی دو طریقے ہیں۔ اور اقبال نے یہ دونوں طریقے قرآن مجید کی اِس آیت سے اخذ کئے ہیں۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝

(اے لوگو اگر تم جویائے حقیقت ہو تو) یقین کرنے والوں کے لئے زمین (کائنات خلقت) میں (ہماری ہستی کی) بہت سی نشانیاں موجود ہیں اور خود تمہارے اندر (ہماری ہستی پر) بہت سے دلائل پوشیدہ ہیں۔ پس کیا تم آفاق اور انفس پر غور نہیں کرو گے؟

مطلب:- کہتے ہیں کہ اے مسلمان! خودی کے مقام کو فاش کرنے یعنی خودی کی پوشیدہ قوتوں کو عیاں کرنے کی مختلف صورتیں ہیں تو ان تمام صورتوں (طریقوں) سے اپنے جوہر کا مظاہرہ کر مثلاً

(۱) دُنیا میں حکومتِ الٰہیہ قائم کر کے اسلام کو مذاہبِ عالم میں سربلند کر دے اور اُس حکومت کو بنی آدم کے حق میں رحمت بنا دے۔

(ب) فطرت کا مطالعہ کر۔ تحقیق و انکشاف کا دور قائم کر دے ایجادات و اختراعات

سے بنی آدم کو فائدہ پہنچا۔
(ج) تزکیۂ نفس اور مجاہدہ کی بدولت (جو دراصل خودی ہے) بلند مقام حاصل کرکے اپنی پاکیزگیٔ سیرت سے مخلوق کو راہِ راست دکھا۔

اب رہا یہ سوال کہ مسلمان اپنی خودی کا مقام کیوں فاش کرے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کو دنیا پر ظاہر کردے۔ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ تم نے اظہار کو مقصدِ حیات کیوں قرار دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اظہار تقاضائے ذات ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں سوال و جواب کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص آپ سے یہ پوچھے کہ اندرائن کا پھل کڑوا اور شہد میٹھا کیوں ہوتا ہے۔ تو آپ یہی جواب دیں گے کہ اندرائن کی ذات کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس کا پھل کڑوا ہو۔ یا کوئی اگر پوچھے کہ آگ جلاتی کیوں ہے؟ تو اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی ذات کا تقاضا یہی ہے کہ وہ جلائے۔

اسی طرح مومن کی زندگی کی غایت یہ ہے کہ اس کی خودی نمایاں ہو جائے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں۔

پسند روح و بدن کی ہے وا نمود اس کو
کہ ہے نہایتِ مومن، خودی کی عریانی

مومن خودی کی نمود کو مقصدِ حیات اس لئے قرار دیتا ہے کہ یہی اس کی ذات کا تقاضا ہے زندگی ظہور چاہتی ہے۔

نہ کر ذکرِ فراق و آشنائی
کہ اصلِ زندگی ہے خود نمائی

اگر ناظرین کو مثال کی حاجت ہو تو محی الدین حضرت عالمگیر اورنگ زیبؒ کی زندگی کا مطالعہ کریں۔ یہ مردِ مومن اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اپنی خودی کو مُفاش ترہ کرتا رہا۔ اسی لئے تو اقبال نے اس کی شان میں یہ غیر فانی شعر کہا ہے:-

درمیانِ کارزارِ کفر و دیں
ترکشِ ما را خدنگِ آخریں

واقعی اورنگ زیبؒ ہندوستان میں کفر و اسلام کی آویزش میں اسلام کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ ۱۷۰۷ء میں یہ مردِ مومن اس دنیا سے کیا گیا، اسلام کا ترکش ہی خالی ہو گیا۔ اور کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ڈھائی سو[۲۵۰] سال سے یہ ترکش خالی پڑا ہوا ہے۔ اسی موضوع پر اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر کو دیکھئے۔

....

....

....

....

نہ ہو مذہب میں گر زورِ حکومت
تو وہ کیا ہے؟ فقط اک فلسفہ ہے (اکبرؔ)

میں اس شرح میں حضرت عالمگیرؒ کی پوری زندگی تو درج نہیں کر سکتا چند واقعات بیان کروں گا۔ تاکہ موجودہ دور کے مسلمان خودی کی عریانی کا مفہوم سمجھ سکیں۔

پہلا واقعہ:- حضرت عالمگیرؒ کی عمر پندرہ سال کی تھی جب ایک مست ہاتھی

ان کی طرف لپکا، لیکن راہِ فرار اختیار کرنے کے بجائے انہوں نے پوری قوت کے ساتھ اپنا نیزہ اس کی مستک میں پیوست کردیا۔ اور جب اس نے اپنے دانتوں سے گھوڑے پر حملہ کیا اور راکب اور مرکب دونوں کو زمین پر گرا دیا تو وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور تلوار نیام سے کھینچ کر اس کی سونڈ پر ایک ضرب لگائی۔ یہ پہلا موقع تھا۔ جب اس عظیم الشان انسان نے اپنی خودی کا مقام دنیا والوں کے سامنے فاش کیا۔

دوسرا واقعہ:- سنہ ۱۶۴۷ء میں بدخشاں کی جنگ میں جب ظہر کی نماز کا وقت آیا تو حضرت عالمگیرؒ نے گھوڑے سے اُتر کر میدانِ جنگ میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھی اور اس موقع پر امامت کے فرائض خود انجام دیئے۔ مآثرِ عالمگیری کا مصنف لکھتا ہے کہ "فرض و سنت دو انی رلبہ تعدیلِ ارکان و کمالِ حضور و اطمینان ادا کردند۔ وعبدالعزیز خاں بمجرد استماع ایں خبر شجاعت اثر حیران استقلال مؤید من عند اللہ شدہ، طرح جنگ نمود، و برزباں گذرانند کہ باچنیں کسے در افتادن بر افتادن است"

یعنی جب عبدالعزیز خاں کو یہ خبر پہنچی کہ حضرت عالمگیرؒ نے تیروں کی بارش میں نمازِ ظہر ادا کی ہے تو وہ حیران رہ گیا اور یہ کہہ کر لڑائی بند کردی کہ ایسے شخص کا مقابلہ کرنا، موت کو دعوت دینا ہے۔

یہ دوسرا موقع تھا۔ جب حضرت عالمگیرؒ نے اپنی خودی کا مقام فاش کیا۔

تیسرا واقعہ:- ۱۶۵۸ء میں جب سموگڈھ میں معرکۂ کارزار گرم ہوا، تو راجپوتوں نے دارا شکوہ کی کامیابی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی کیونکہ یہ عالمگیرؒ اور دارا شکوہ کے درمیان جنگ نہیں تھی بلکہ اسلام اور متحدہ قومیت کا آپس میں تصادم تھا۔ ہندو

اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ اگر دارا شکوہ ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا تو اکبر کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ یعنی اسلام کا خاتمہ یقینی ہے۔

اسی مقصد کے حصول کی غرض سے راجپوتوں نے مسلمانوں کے لشکر پر اس شان سے حملہ کیا کہ صفوں کو درہم برہم کرتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے۔ جہاں حضرت عالمگیرؒ ایک بلند و بالا ہاتھی پر سوار فوجوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ جب انھوں نے یہ رنگ دیکھا تو ہمراہیوں کو حکم دیا کہ میرے ہاتھی کے چاروں پاؤں آہنی زنجیر سے جکڑ دیئے جائیں تاکہ وہ بھاگ نہ سکے۔ حملہ کی شدت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ راجہ روپ سنگھ راٹھور جب ہاتھی کے پاس پہنچا تو جوشِ تہوّر میں گھوڑے سے اُتر کر سب سے پہلے ہاتھی کے پاؤں پر پے در پے کئی وار کئے پھر تلوار سے ہودے کی رسیاں کاٹنے لگا۔ لیکن حضرت عالمگیرؒ کے استقلال میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔

یہ تیسرا موقع تھا جب اُنھوں نے اپنی خودی کو فاش کیا۔

چوتھا واقعہ:- ۱۷۰۵ء میں جب ان کی عمر ۸۷ سال کی تھی اور وہ قلعہ واگن گیرا کا محاصرہ کررہے تھے تو ایک شب اس قدر زبردست بارش ہوئی کہ تمام خیمے اکھڑ گئے اور شاہی کیمپ جھیل میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن جب صبح ہوئی تو عالمگیرؒ اپنی فوج کے سپاہیوں کے ساتھ جیالوں کی طرف معروفِ عمل ہو گئے اور بنفسِ نفیس تمام فوج کو اپنی نگرانی میں دوسرے مقام پر منتقل کرکے بڑھاپے میں اپنی خودی کا مقام فاش کیا۔

پانچواں واقعہ:- ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء کو جبکہ وفات میں صرف تین گھنٹے باقی رہ

گئے تھے اس مردِ مومن نے شدید بخار کی حالت میں فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی اور پھر خیمہ میں آکر اوراد و وظائف میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد غفلت طاری ہونے لگی اور سانس بھی سینے میں اٹکنے لگی لیکن اس کے باوجود انگلیاں حرکت کرتی رہیں اور زبان کلمۂ شہادت کی تکرار کرتی رہی۔ یہاں تک کہ آٹھ بجے کے قریب اِن کی رُوح جوارِ رحمتِ ایزدی میں داخل ہوگئی۔ یعنی مرتے وقت بھی اس مردِ مومن نے اپنی خودی کا مقام دُنیا پر فاش کر دیا۔

نوٹ:۔ ہندو قوم میں سر جادو ناتھ سرکار نے بھی حضرت عالمگیرؒ کی رُوحانیت کا اِن الفاظ میں .... اعتراف کیا ہے کہ جانکنی کی حالت میں بھی اورنگ زیب کی زبان کلمۂ طیبہ کی تکرار میں مصروف رہی۔

(دیکھو تاریخ اورنگ زیب مؤلفہ سرکار جلد پنجم صفحہ ۲۵۸)

ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض

۱

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب!
مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بیتاب!
اے وادیٔ لولاب!

گر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب!
دیں بندۂ مومن کے لئے موت ہے یا خواب!
اے وادیٔ لولاب!

ہیں ساز پہ موقوف نوا ہائے جگر سوز
ڈھیلے ہوں اگر تار تو بیکار ہے مضراب!
اے وادیٔ لولاب!

مُلّا کی نظر نورِ فراست سے ہے خالی
بے سوز ہے میخانۂ صوفی کی مئے ناب!
اے وادیٔ لولاب!

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب!
اے وادیٔ لولاب!

تمہید:۔ اِس عنوان کے تحت اقبالؔ نے اُنیس ۱۹ نظمیں لکھی ہیں، جن میں سے دو نظمیں تو صرف ایک ہی ایک شعر کی ہیں۔ مُلّازادہ ضیغم ایک فرضی نام ہے۔ ضیغم شیر کو کہتے ہیں۔ مُراد اس سے یہ ہے کہ اقبالؔ کشمیریوں میں شیروں کی صفات پیدا کرنی چاہتے ہیں۔

لولابی۔ وادیٔ لولاب کا باشندہ۔ لولاب اِس وادی کا نام ہے جو سرینگر اور بارہ مولہ کے درمیان واقع ہے چونکہ اس وادی میں بہت سے علمار اور صلحار پیدا ہوئے ہیں۔ اِس لئے اقبالؔ نے اپنے مُلّازادہ کو لولابی قرار دیا ہے۔ امام العصر

راس المحدثین حضرت مولینا علامہ سید انور شاہ صاحب مرحوم بھی اِسی وادی کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں پیدا ہوئے تھے اور میری رائے میں لولاب کے لئے یہی فخر کافی ہے کہ شاہ صاحب جیسا یگانۂ روزگار انسان وہاں پیدا ہوا تھا۔ اگرچہ مرحوم ہر فن میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ لیکن حدیث اور فقہ میں بلا شُبہ تمام دُنیا کے اسلام میں کوئی شخص اِن کا ہمسر نہیں تھا۔

بیاض لغوی معنی تو سفیدی کے ہیں۔ چنانچہ سواد و بیاض سے کون واقف نہیں ہے؟ لیکن یہاں یہ لفظ سادہ اوراق کے معنوں میں مستعمل ہے پہلے زمانہ میں بلکہ انقلاب ۱۸۵۷ء تک جبکہ مسلمان ڈگریوں کے بجائے علم کے طلبگار تھے۔ ہر بڑے عالم کے پاس ایک بیاض ہوتی تھی جس میں وہ اپنے پسندیدہ اشعار یا اپنے خیالات و افکار یا علمی نکات یا متقدمین کی کتابوں سے اقتباسات درج کیا کرتا تھا۔

اِن تمام نظموں میں اقبالؔ نے کشمیریوں کو حریت کا پیغام دیا ہے اور اس کے ضمن میں ان کو زندگی کے اعلیٰ حقائق سے بھی آگاہ کیا ہے۔ لیکن اندازِ بیان ایسا ہے کہ ہر شخص بقدرِ ظرفِ خویش اِن سے اِستفادہ کر سکتا ہے۔

اقبالؔ کی زندگی کے آخری دَور میں کشمیریوں کے اندر آزادی کی تڑپ پیدا ہو گئی تھی۔ ان کی امداد کے لئے لاہور میں ایک کشمیر کمیٹی بھی قائم ہوئی تھی علامہ مرحوم کے دل میں چونکہ ہر مظلوم طبقہ کے لئے ہمدردی کا جذبہ موجزن تھا۔ اِس لئے اُنھوں نے کچھ عرصہ تک اس کمیٹی کو بھی اپنے مشوروں سے مستفید کیا تھا۔ چنانچہ ان نظموں میں اُنہوں نے اُس محبت کا ثبوت دیا ہے جو ان کو اس شریف قوم کے ساتھ تھی۔

مطلب:۔ پہلا بند: بظاہر وادیٔ لولاب سے خطاب کیا ہے۔ لیکن دراصل اِس سے کشمیر کے باشندے مُراد ہیں یا بالمعنی الاخص وہ لوگ جو اس وادی میں رہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ اے باشندگانِ کشمیر! قدرت نے تمہیں ایسا حسین اور شاداب مُلک عطا کیا ہے جس کی نظیر شاید دُنیا کے پردہ پر کہیں نہ ہوگی۔ یہاں کے چشموں کا پانی اپنی رونق پاکیزگی اور صفائی کے اعتبار سے سیماب معلوم ہوتا ہے اور یہاں کی فضا اِس قدر دلکش اور مسرت انگیز ہے کہ مُرغانِ سحر (وہ پرندے جو بالعموم صبح کے وقت چہچہاتے ہیں) کو نغمہ سرائی پر مائل کرتی رہتی ہے۔ لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے اگر ایسے مُلک کے باشندے غُلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہوں۔

دوسرا بند:۔ اے کشمیر کے مسلمانوں! اگر تمہارے علمار اور صوفیا تمہارے اندر جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا نہ کر سکیں یا اگر تمہاری نماز تمہارے دلوں میں یہ ولولہ پیدا نہ کر سکے تو بہر صورت دین کی اِس دُنیا میں کوئی قدر منزلت باقی نہیں رہ سکتی۔ اِس روشنی اور ترقی کے زمانے میں جو دین، دینداروں کے اندر سربلندی کا جذبہ اور آزادی کا ولولہ پیدا نہیں کر سکتا وہ دین نہیں ہے بلکہ یا تو افیون کی گولی ہے یا موت کا پیغام۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے یہ ایسی بات کہی ہے جس پر خود دیگر مُلکوں کے مسلمانوں کو بھی غور کرنا چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہماری نمازوں، روزوں اور دینداری کے دوسرے کاموں سے ہمارے اندر انگریزوں اور امریکہ کی غلامی سے نکلنے کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ کیا ہم اپنے اندر کامل دلیری سے خروج کے اعلان

کی طاقت پاتے ہیں اگر نہیں تو پھر ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ لینن (KARL MARX) کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ۔ مذہب عوام کے حق میں بمنزلۂ افیون ہے جس کی بدولت وہ اپنے مقام اور اپنی حقیقت سے غافل ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی بادشاہوں کی غلامی قبول کر لیتے ہیں۔

واضح ہو کہ اس شعر میں منبر کنایہ ہے حضرات علماء سے۔ محراب کنایہ ہے نماز اور دیگر ارکانِ اسلام سے، اور خواب کنایہ ہے افیون سے۔ یعنی اگر دین بندۂ مومن کو جہاد پر آمادہ نہیں کر سکتا تو وہ دین نہیں ہے بلکہ پیامِ موت ہے یا افیون (نشہ آور شئے) ہے جو قوتِ عمل کو مُردہ کر دیتی ہے۔ بہرحال نتیجہ یکساں ہے۔ مُردہ اور خفتہ دونوں عمل سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اگر مجھے ناظرین کی ناراضگی کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں وضاحت کرتا کہ وہ دینِ اسلام جس نے جاہل عربوں کو ایک صدی کے اندر چین سے لے کر مراکش تک ساری مہذب دنیا کا سردار بنا دیا تھا وہی پیغامِ حیات، افیون کی گولی میں کس طرح مبدّل ہو گیا۔ لیکن ابھی میری قوم میں سچی باتیں سننے کی "شکتی" پیدا نہیں ہوئی ہے اس لئے مصلحتاً قلم روکتا ہوں۔

اتنا تو ہر مسلمان مانتا ہے بلکہ صدقِ دل سے تسلیم کرتا ہے کہ اب ہماری نمازیں ہم کو فحشاء سے نہیں روکتیں، اب ہمارے روزے ہمارے اندر تقویٰ پیدا نہیں کرتے، اب حج کرنے سے ہمارے اندر کوئی انقلاب پیدا نہیں ہوتا، اب قربانی سے ہماری باطنی اصلاح نہیں ہوتی۔ ہر سال منیٰ کے میدان میں لاکھوں حیوانات کا خون بہایا جاتا ہے لیکن خون بہانے والوں کا نفسِ امّارہ مُردہ تو کیا ہوتا وہ تو

گرا ہی یا ہمیں بیچ کر اور بھی فربہ ہو جاتا ہے۔ ہم مسجد سے نکل کر اور حج سے واپس آ کر اپنے اندر کوئی تبدیلی محسوس نہیں کرتے ان باتوں سے ثابت ہوا کہ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی خرابی ضرور موجود ہے جو یہ "نسخۂ کیمیا" اب بیکار ہو گیا۔ اجزا تو وہی ہیں لیکن وہ اثر مرتب نہیں ہوتا۔ تو مسلمان خود غور کریں کہ ایسا کیوں ہے؟

تیسرا بند:۔ اس بند میں اقبالؔ یہ بتاتے ہیں کہ اب "منبر اور محراب" یعنی دینِ اسلام سے ہنگامہ برپا کیوں نہیں ہوتا۔ بظاہر ہم بھی اُسی دین کے پیرو ہیں جس کی پیروی کا فخر سلطان ٹیپو شہیدؒ کو حاصل تھا لیکن ہم انگریز کے خلاف اعلانِ جہاد نہیں کر سکتے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ اقبالؔ کے الفاظ میں یہ ہے کہ نوائے جگر سوز، ساز پر موقوف ہیں۔ اگر ساز کے تار ہی ڈھیلے ہوں تو مضراب بیکار ہے۔ یعنی جہاد کا ولولہ، تکمیلِ خودی پر موقوف ہے۔ اگر خودی ہی ناقص ہے تو قرآنِ حکیم کی تلقینِ جہاد کس طرح مؤثر ہو سکتی ہے؟

واضح ہو کہ اس شعر میں اقبالؔ نے فاعل اور قابل کے ربطِ باہمی کو واضح کیا ہے فاعل اُسی وقت مؤثر ہو سکتا ہے جب قابل میں متاثر ہونے کی صلاحیت پہلے سے موجود ہو۔ اگر قابل میں اثر پذیری کی استعداد نہیں ہے تو فاعل کی تاثیر سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ زید نے اپنے لڑکے کو اُستاد کے حوالے کیا کہ اسے موسیقی سکھاؤ۔ لیکن لڑکے میں موسیقی کی صلاحیت ہی نہیں تھی اس لئے وہ اس فن سے آگاہ نہ ہو سکا یہاں فاعل کا کوئی قصور نہیں ہے، قابل کا قصور ہے۔

یہ سچ ہے کہ مضراب کے بغیر ساز کے تاروں سے آواز نہیں نکل سکتی۔ لیکن مضراب اُسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب تار سخت ہوں یعنی ان میں

یہ صلاحیت پہلے سے موجود ہو کہ مضراب لگائی جائے تو آواز پیدا ہو سکے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگرچہ فاعل اور قابل دونوں ضروری ہیں۔ لیکن قابل میں قابلیت کا ہونا مقدم ہے۔ قرآنِ مجید کا فیصلہ بھی یہی ہے۔ کہ وہ ہدایت تو سب کے لئے ہے لیکن اُس سے استفادہ متقی ہی کر سکتے ہیں۔

موجودہ دور کے مسلمان بھی قرآنِ حکیم میں جہاد کی آیات پڑھتے ہیں لیکن اُن کی تلاوت سے ان کے قلوب میں جہاد کا ولولہ پیدا نہیں ہوتا، کیوں؟ اس لئے کہ

ع ڈھیلے ہوں اگر تار تو بیکار ہے مضراب

اندریں حالات اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ قرآن مجید یا دینِ اسلام سے استفادہ کریں تو پہلے ہمیں اپنے زاویۂ نگاہ میں تبدیلی پیدا کرنی ہو گی۔ یعنی پہلے دین کا مفہوم متعین کرنا ہو گا اگر دینِ اسلام سے ہماری مراد یہ ہے کہ اسلام وہ دین ہے جس کے ارکان پر عمل کرنے سے مرنے کے بعد جنت مل جائے گی تو پھر مضراب بیکار ہے یعنی آیاتِ جہاد ہمارے اندر کوئی تاثیر یا انقلاب پیدا نہیں کر سکیں گی۔ اپنے مطلب کو واضح کرنے کے لئے میں صرف ایک آیت اس جگہ درج کرتا ہوں۔

قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَ
تُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ
تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا
حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ (۹: ۲۴)

اے رسولؐ مسلمانوں سے کہہ دیجئے اگر تمہیں اپنے باپ اور بیٹے اور اپنے بھائی اور اپنی بیویاں اور اپنے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت

جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں خوف ہے اور وہ محلات اور کوٹھیاں جنہیں تم پسند کرتے ہو، اللہ اور اس کے رسولؐ اور اُس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز اور زیادہ محبوب ہیں تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم صادر فرمائے اور اللہ کبھی نافرمانی کرنے والوں (فاسقوں) کو ہدایت نہیں کرتا۔

ناظرین غور کریں کہ جہاد کی اہمیت، ضرورت اور فرضیت کو ذہن نشین کرنے کے لئے کیا ان الفاظ سے بڑھ کر مؤثر الفاظ ممکن ہو سکتے ہیں؟ لیکن اس کے باوجود ہمارے اوپر اس آیت کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا جہاں تک میں نے قرآنِ حکیم کا مطالعہ کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس سے زیادہ مؤثر اور کوئی آیت مجھے نظر نہیں آئی، لیکن ہماری زندگی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اس کی تلاوت سے ہمارے اندر جہاد کا کوئی ولولہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ:۔

ڈھیلے ہوں اگر تار تو بیکار ہے مضراب

اس آیت کے آخری جملہ پر غور کیجئے اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون واضح طور پر بیان فرما دیا ہے کہ میں فاسقوں کو ہدایت نہیں دوں گا۔

اقبالؔ کی اصطلاح میں فاسق وہ ہے جس کی خودی کے تار ڈھیلے ہوں اس لئے وہ مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کرتے ہیں اگر تم یہ چاہتے ہو کہ قرآنی مضراب کی بدولت تمہارے تاروں سے نوائے جگر سوز پیدا ہو جائے تو انہیں کس لو۔

دینِ اسلام (قرآن) تو آج بھی وہی ہے جو خالدؓ جانباز کے زمانے میں تھا لیکن انہوں نے اپنی خودی کے تار کس لئے تھے۔ اس لئے ان میں جہاد کا ولولہ پیدا ہو گیا۔ اگر ڈھیلے ہوتے تو جنگ موتہ میں ان کے ہاتھ سے نو تلواریں کس طرح ٹوٹ سکتی تھیں؟

اگر مسلمان لینن کے مقولہ کی تردید کرنی چاہتے ہیں تو انہیں فسق و فجور سے توبہ کر کے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرنی لازمی ہے۔ کیونکہ اگر وہ اتباعِ رسولؐ کی بدولت اپنی خودی کو مستحکم نہیں کریں گے تو محض تلاوت، اُن کے اندر جہاد کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتی۔ تار ڈھیلے ہوں تو لاکھ مضراب لگاؤ۔ آواز پیدا نہیں ہو سکتی، عاشق لاکھ تلاوت کرے جہاد کا ولولہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

چونکہ اقبال نے اس شعر میں مسلمانوں کو اللہ کے قانون سے آگاہ کر دیا ہے اور دنیا میں سربلندی کا راز بتا دیا ہے۔ اِس لئے میں چاہتا ہوں کہ ہر مسلمان اس مصرع کو حرزِ جان بنا لے۔

ع ڈھیلے ہوں اگر تار تو بیکار ہے مضراب

چوتھا بند:- کہتے ہیں کہ دینِ حق کی رسوائی کا دوسرا سبب یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کے رہنما ناقص ہیں (پہلا سبب یہ ہے کہ تار ڈھیلے ہیں) مسلمانوں کی رہنمائی کے دو مدعی ہیں۔ مُلا اور صوفی۔ لیکن کیفیت یہ ہے کہ

(۱) مُلا کی نظر تو اُس نور سے محروم ہے جو فراستِ مومنانہ سے پیدا ہوتا ہے اور

(۲) صوفی کے میخانہ کی شراب میں نشہ باقی نہیں رہا۔

یعنی مُلا کی صحبت میں بیٹھو تو ایمان کا رنگ پیدا نہیں ہوتا اور صوفی کی مجلس میں حاضری دو تو عشقِ رسولؐ (سوز) پیدا نہیں ہوتا۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ دونوں ایمان اور عشق کے سرچشمہ یعنی قرآنِ حکیم سے دور ہو گئے ہیں۔ مُلا حسبِ معمول قدیم، آج بھی اِس فروعی مسائل میں اُلجھا ہوا ہے جن کا ہماری علمی، سیاسی، تمدنی، معاشرتی، معاشی یا روحانی زندگی پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ مثلاً

(ا) تراویح کی رکعات

(ب) اِستنجاء بالمدر افضل ہے یا استنجاء بالماء؟

(ج) مسح چوتھائی سر کا کرنا چاہیئے یا صرف سر کے اگلے حصہ کا؟

(د) مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ پڑھے یا نہ پڑھے؟

(ہ) آمین بالجہر افضل ہے یا آمین بالخفی؟

(و) جمعہ کی دوسری آذان صحنِ مسجد میں ہو یا منبر کے سامنے؟

(ز) ہاتھ زیرِ ناف باندھے جائیں یا بالائے ناف یا سینہ پر؟

اِن فروعی مسائل میں انہماک کا قدرتی نتیجہ نکلا کہ زندگی کے اہم مسائل مُلا کی نظر سے پوشیدہ ہو گئے یعنی اُسے اُن کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ ساری عمر انہی دور از کار بحثوں میں گذر جاتی ہے اور اُسے یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ آج میری قوم کن مسائل سے دوچار ہو رہی ہے۔ اِس لئے اقبال نے یہ لکھا ہے کہ

ع مُلا کی نظر نورِ فراست سے ہے خالی

اب رہے صوفی تو ان کی قدامت پرستی کا یہ عالم ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا مسندِ ارشاد پر بیٹھ جاتا ہے لیکن نہ وہ یہ سوچتا ہے کہ جب میرے اندر خود کوئی روحانیت نہیں ہے تو میں قوم کی یا مریدوں کی کیا اصلاح کروں گا اور نہ مرید یہ سوچتے ہیں کہ مسندِ ارشاد کوئی دنیاوی بادشاہت تو نہیں ہے کہ باپ کے بعد بیٹا جانشین ہو جاتا ہے خواہ وہ کتنا ہی نالائق کیوں نہ ہو۔

اِس تقلید اور قدامت پرستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ عقابوں کے نشیمن رفتہ رفتہ زاغوں کے تصرف میں آگئے۔ جب پیر کے دل میں خود ہی سوز و گداز کی کیفیت نہ ہو تو مریدوں

کے اندر یہ رنگ کیسے پیدا کر سکتا ہے؟

پانچواں بند:- اس بند میں اقبال نے اس بات پر اپنے دلی قلق کا اظہار کیا ہے کہ صدیوں سے کشمیر میں کوئی ایسا مردِ مومن (درویش) پیدا نہیں ہوا جس کی روحانیت سے وہاں کے باشندوں میں کوئی انقلاب پیدا ہو سکتا۔

نوٹ:- کشمیر ہی پر کیا موقوف ہے۔ آج ہندوستان، پاکستان بلکہ ساری دُنیائے اِسلام میں ایسے درویش کمیاب ہیں۔ اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ بزرگانِ دین کے جانشین وہ لوگ ہو گئے جو علم و عمل دونوں سے بیگانہ تھے۔ اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ جب لوگوں کے دلوں میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ دنیاوی خلافت باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہو سکتی ہے تو روحانی خلافت تو بدرجہ اولیٰ منتقل ہو سکتی ہے۔

یعنی تمام خرابیوں کی جڑ ملوکیت ہے۔

میری رائے میں جب تک دُنیائے اِسلام سے ملوکیت کا خاتمہ نہیں ہو گا مسلمانوں کی اصلاح یا اِسلام کی سربلندی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ گذشتہ ایک ہزار سال میں اصلاح کی جس قدر کوششیں ہوئیں وہ سب ناکامی کی آغوش میں سو گئیں۔ اِس لئے کہ مسلمانوں کے زوال کا باعث نہ بے زری ہے نہ جہالت بلکہ ملوکیت ہے اور مُلا و پیر اس غیر اسلامی نظام کے سب سے بڑے معاون ہیں۔ اور میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ملوکیت میں کوئی مُسلمان خدا پرستی نہیں کر سکتا کیونکہ ملوکیت تو اسلام کی ضد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر مومن نے ہر زمانے میں ملوکیت کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا ہے۔ چنانچہ اقبال نے ان شعروں میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے ۔

با سلاطیں در فتد مردِ فقیر　　از شکوہِ بوریا لرزد سریر

قلبِ او را قوت از جذب و سلوک　　پیشِ سلطاں نعرۂ او لاملوک

۳

موت ہے اِک سخت تر جس کا غلامی ہے نام
مکر و فنِ خواجگی کاش سمجھتا غلام!
شرعِ ملوکانہ میں جدتِ احکام دیکھ!
صور کا غوغا حلال حشر کی لذت حرام
اے کہ غلامی سے ہے رُوح تری مضمحل
سینۂ بے سوز میں ڈھونڈ خودی کا مقام

پہلا شعر:- کہتے ہیں کہ ایک موت تو وہ ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روح، انسان کے بدن سے اپنا تعلق منقطع کر لیتی ہے۔ لیکن خود زندہ رہتی ہے۔ اس طبعی موت کے علاوہ ایک موت اور بھی ہے جو اس سے زیادہ شدید ہے۔ اِس کا نام غلامی ہے جس میں روح بدن سے تعلق تو منقطع نہیں کرتی لیکن خود مر جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بظاہر انسان زندہ نظر آتا ہے لیکن در اصل مُردوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے[1]۔

[1] اقبال نے زبورِ عجم میں غلامی کے مفاسد پر ایک مستقل باب باندھا ہے۔ جس کا عنوان ہے، بندگی نامہ، اِس سے دو تین شعر اس جگہ نقل کرتا ہوں:-

از غلامی دل بمیرد در بدن　　از غلامی روح گردد بارِ تن
از غلامی بزمِ ملت فرد فرد　　این و آں با این و آں اندر نبرد
از غلامی مردِ حق زنار بند　　از غلامی گوہرش ناارجمند
کور ذوق و نیش را دانستہ نوش
مردۂ بے مرگ و نعشِ خود بدوش

ملوکیت کی کامیابی اور اس کی بقاء کا راز یہ ہے کہ وہ خود بھی مکاری اور عیاری کے فن میں طاق بلکہ شہرۂ آفاق ہوتی ہے اور اس فنِ لطیف کے تمام ماہروں مثلاً سرمایہ داروں، جاگیرداروں، زمینداروں، ملاؤں اور پیروں کی سرپرستی بھی کرتی ہے اور یہ تمام طبقات، انسانوں کو غلام بنانے میں ملوکیت کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ بلکہ اس کارِ خیر میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں کیونکہ ان کو خود اپنی بقاء اور راحت اسی میں نظر آتی ہے کہ انسان خدا کے بجائے انسانوں کی غلامی کا خوگر ہو جائے۔ اور یہ اسی کوشش کا نتیجہ ہے کہ ان طبقات کے افراد اپنے محدود دائرہ میں بادشاہی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ اور ان کی اکثریت انسانوں کو حیوان سے بھی بدتر سمجھتی ہے۔ یہ اپنی جاگیر میں جس طرح لڑکی کو چاہیں اپنی خواہشاتِ نفسانی کی تسکین کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔ اور جس شخص کو چاہیں اپنے خانوں سے پٹوا کر ملک عدم روانہ کر سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ لوگ اپنی زمینداری میں اپنے کاشتکاروں کی جان، مال اور حریت اور عورت سب کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا۔[1]

---

[1] میں نے جو کچھ لکھا ہے سب ذاتی مشاہدات کی بنا پر لکھا ہے کیونکہ میں کئی سال تک ہندوستان کی ریاستوں میں بھی زندگی بسر کر چکا ہوں۔ بہت ہی اچھا ہوا جو حکومتِ ہند نے ظلم و ستم اور بدکاری کے ان مرکزوں کا خاتمہ کر دیا۔ یہ ریاستیں انگریزوں نے اپنی ملوکیت کی تقویت کے لئے قائم رکھی تھیں۔ چنانچہ انقلاب ۱۸۵۷ء میں نظام بدفرجام سے لے کر دارالسرور رامپور تک سب مسلمان ریاستوں نے مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے کافروں کی مدد کی تھی۔

دوسرے مصرع میں اقبالؔ یہ کہتے ہیں کہ کاش غلام، ملوکیت کے مکر و فن سے آگاہی حاصل کر سکتا۔ تاکہ وہ اس کے ابطال پر کمر باندھ سکتا۔

مطلب یہ کہ ملوکیت کا سارا نظام مکر و فن عیاری اور مکاری دھوکہ اور فریب دروغ گوئی اور دغابازی پر مبنی ہے۔ ملوکیت اپنی بقاء کے لئے ہر قسم کے مکر و فن سے کام لیتی ہے۔ مثلاً

ملوکیت کے علمبردار بادشاہ اور نواب دراصل اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ (کیونکہ اگر وہ اسلام پر عمل کریں تو سب سے پہلے تخت و تاج دونوں سے دست بردار ہونا پڑے گا) لیکن دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے علماء کو گرانقدر وظیفے دیتے ہیں۔ دارالعلوم قائم کرتے ہیں۔ محکمۂ شرعیہ قائم کرتے ہیں۔ ناظمِ امور مذہبی کا تقرر کرتے ہیں۔ بلکہ صدرالصدور امورِ مذہبی کا عہدہ عالمِ وجود میں لاتے ہیں۔ لیکن اس بات کا پختہ طور سے انتظام کر دیتے ہیں کہ صدرالصدور یا ناظم یا مفتی یا قاضی یا مولوی یا شیخ الجامعہ یا حضرتِ شیخ الاسلام کوئی فرد، رعایا میں ملوکیت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا نہ کر سکے، یا رعایا کو قرآن کی روح سے آگاہ نہ کر سکے۔ یعنی یہ نہ بتا سکے کہ قرآن نے ملوکیت کو سب سے بڑی لعنت قرار دیا ہے۔

چنانچہ ملوکیت کے زیرِ اہتمام جو دینی مدارس قائم ہوتے ہیں ان میں سب کچھ پڑھایا جاتا ہے لیکن طلبہ کو حریت کا درس نہیں دیا جا سکتا۔

اور اگر کوئی، اللہ کا بندہ اس جرم کا مرتکب ہو جائے تو اسے فوراً ملازمت سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے۔[1] کیونکہ شرعِ ملوکانہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ رعایا کے لئے صور کا غوغا تو حلال ہے لیکن حشر کی لذت حرام ہے۔ یعنی مدرسین اور طلبہ مدرسہ کے حجروں میں بیٹھ کر قدوری، کنز، ہدایہ، فتح القدیر شامی، مبسوطِ سرخسی، عالمگیری اور قاضی خان کی کیف آور روشنی میں، خلافت اور حکومتِ الٰہیہ کے دعوے پر دلائل پر علمی بحثیں تو کر سکتے ہیں (غوغا) لیکن حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کے لئے میدانِ عمل میں نہیں آ سکتے (حشر) یعنی ملوکیت کے خلاف غوغا آرائی جس قدر چاہے کر سکتے ہیں لیکن صف آرائی نہیں کر سکتے۔ یعنی علماء زبان سے تو کہہ سکتے ہیں۔ "اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ" حکومت کا حق اللہ کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ لیکن اس کے تقاضا پر نہ خود عمل کر سکتے ہیں نہ دوسروں کو عمل کی تلقین کر سکتے ہیں۔ اور نہ اپنے طلبہ میں یہ روح پیدا کر سکتے ہیں۔

دوسرا شعر۔ اس کا مطلب تو ضمنی طور پر پہلے شعر کی شرح میں بیان ہو گیا ہے لیکن یہاں قندِ مکرر کے طور پر اس قدر صراحت کافی ہے کہ شرعِ ملوکانہ میں صور کا

---

[1] بطلِ حریت مجاہدِ ملت جامع معقول و منقول حاوی فروع و اصول راس العلماء رئیس الحکماء جانشین مولانا فضل حق خیرآبادی مرحوم حضرت مولانا مولوی معین الدین صاحب اجمیری مرحوم و مغفور کو نظام بدفرجام نے محض اس لئے مدرسہ معینیہ اجمیر کی صدر مدرسی سے علیحدہ کر دیا تھا کہ حضرت موصوف نظام کے معبودان سفید فام کے دشمن تھے اور طلبہ کو ان کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنے کا درس دیتے تھے۔ یہ میری آنکھوں دیکھی بات ہے ۱۲

غوغا تو حلال ہے لیکن حشر کی لذت حرام ہے یعنی ملوکیت کا شیوہ یہ ہے کہ وہ ازراہِ ڈپلومیسی (عیاری) غلاموں میں سے بعض کو "ہزہائینس" یا "ہزہائینس" تو بنا دیتی ہے لیکن حقیقت کو ظاہر نہیں کرتی۔

چنانچہ مصر، عراق، فلسطین، شام اور پاکستان کی حالت اقبالؔ کے اس دعویٰ پر شاہدِ عادل ہے۔ دیکھ لیجئے مصر میں ہزمجسٹی بھی ہے اور اس کے تمام لوازمات بھی ہیں۔ یعنی صورِ غوغا بطرزِ احسن موجود ہے لیکن گذشتہ سال جب مصریوں نے حریت یعنی حشر کی لذت سے بہرہ اندوز ہونا چاہا تو انگریزوں نے سکندریہ کی بندرگاہ میں جنگی جہازوں کی ایسی دلفریب نمائش کی کہ کراچی کی نمائش بھی اس کے آگے ماند پڑ گئی۔ چونکہ دولتِ خداداد پاکستان خود اس قتالۂ عالم کی زلفِ گرہ گیر میں اسیر ہے، اس لئے اس ظلم و ستم کے خلاف، جو ملوکیت کے علمبرداروں نے مصریوں پر روا رکھا۔ زبان تک نہ ہلا سکی اور راتوں کی تنہائی میں یہ شعر پڑھ پڑھ کر دل کو تسلی دیتی رہی۔

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ تم یو۔ این۔ او میں جس قدر چاہو غوغا آرائی کر لو لیکن آزادی کی نعمت حاصل نہیں کر سکتے۔ یعنی حشر برپا نہیں کر سکتے۔ تیسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اسمبلی میں جس قدر چاہو بحثیں کر سکتے ہو، ہر روز ایک بل پاس کر سکتے ہو لیکن حیات نو یعنی حریت کی لذت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے، غلامی کی زنجیروں کو نہیں توڑ سکتے ورنہ برطانی ہوائی جہاز ایک منٹ میں تمہارے گھر کو گھروندہ بنا کر

رکھدیں گے۔ یقین نہ ہو تو تجربہ کر کے دیکھ لو۔

تیسرا شعر۔۔ غلامی کی مذمت کرتے اور اس کے نتائج واضح کرنے کے بعد اقبالؔ کشمیری مسلمان کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ اپنے اندر خودی پیدا کر لے یا اپنی خودی کو زندہ کر لے یا اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔ اقبالؔ کی رائے میں اگر کوئی قوم غلامی کی زنجیروں کو توڑنا چاہتی ہے تو اس کی صورت صرف یہی ہے کہ وہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع سے اپنی خودی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔ پھر وہ قوم غلام نہیں رہ سکتی۔

سُنا ہے میں نے غلامی سے اُمتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذّت و نمود میں ہے

بات صرف اتنی سی ہے کہ سرکارِ دوعالم کی غلامی اختیار کرنے کے بعد ہر مسلمان پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ

اس کائنات کا خالق، رازق، مالک اور حاکم صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اور کوئی مخلوق کسی اعتبار سے بھی اس کی ہمسر نہیں ہے اور نہ اس کی صفات میں شریک ہو سکتی ہے۔ توحیدِ الٰہی کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ

(۱) نہ کوئی ہستی وجود میں اس کی شریک ہے اگر کسی کو موجود مانا جائے تو شرک فی الوجود یا شرک فی الذات لازم آجائے گا۔

(ب) نہ کوئی ہستی صفات میں اس کی شریک ہے۔ ورنہ شرک فی الصفات لازم آجائے گا۔

(ج) نہ کوئی ہستی معبود ہو سکتی ہے ورنہ شرک فی العبادۃ لازم آجائے گا۔

(د) نہ کوئی ہستی حکمراں ہو سکتی ہے ورنہ شرک فی الحکم لازم آجائے گا۔ اور شرک کی بخشش نہیں ہوگی اس لئے سچا مسلمان جو قرآن کی رُوح سے آشنا ہو چکا ہے وہ غیر اللہ کی اطاعت نہیں کر سکتا۔ یعنی کسی انسان کو اپنا حاکم تسلیم نہیں کر سکتا۔ اور اس کے وضع کردہ قانون کی پابندی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کی رائے میں اسلام اور غلامی یا مسلمان اور غلام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ غلام مسلمان نہیں ہو سکتا اور مسلمان غلام نہیں ہو سکتا۔

۳

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اُٹھتی ہے آہِ سوزناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستاں بیدردیِ ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟

مطلب۔۔ اس نظم میں اقبالؔ نے کشمیریوں کی غلامی پر ماتم کیا ہے کہتے ہیں کہ انقلابِ روزگار تو دیکھو آج وہ کشمیری غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو اپنی نفاست، ذہانت، دانشمندی اور تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے ایرانیوں کے ہم پلّہ ہیں۔ واضح ہو کہ تیرھویں صدی عیسوی سے سترھویں صدی تک

تبلیغ اور تجارت کے سلسلہ میں اس قدر ایرانی خاندان کشمیر میں آکر آباد ہو گئے کہ اہلِ نظر اس خطۂ بے نظیر کو بجا طور پر "ایرانِ صغیر" کہنے لگے۔

اِس میں کیا شک ہے کہ جب کوئی مسلمان کسی بادشاہ یا نواب سے مرعوب ہو جاتا ہے اور کلمۂ حق کہنے کے بجائے اس کی غلامی اختیار کر لیتا ہے۔ تو فرشتوں کے سینوں سے بے اختیار آہ نکلتی ہے۔ یعنی یہ حادثہ ساری دُنیا کے لئے رنج و غم کا موجب ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ وہ دُنیا کو ملوکیت کی لعنت سے پاک کر دے گا۔ لیکن اگر وہ خود ہی اس لعنت میں گرفتار ہو جائے تو پھر بنی آدم کے حق میں اس سے بڑھ کر اور بدبختی کیا ہو سکتی ہے یعنی پھر کون شخص انسانوں کو غلامی کی لعنت سے پاک کر سکتا ہے۔ یعنی مسلمان کا غلام ہو جانا ساری دُنیا کے لئے پیامِ ہلاکت ہے۔

غلام ہو کر کشمیر کا مسلمان جن مصائب میں گرفتار ہو گیا اور جن آفات کا شکار ہو گیا، اُن کی داستان کسی انسان سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کوہستان کے دامن میں دہقانوں کا ہر گھر۔ غم خانہ، بنا ہوا ہے اور زبانِ حال سے باشندوں کی غربت فلاکت اور مصیبت کی داستان سُنا رہا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ قوم جو حسب و نسب کے اعتبار سے اس قدر اعلیٰ ہے اور ایسی ہنرور ہے اور اس درجہ ذہین اور طباع ہے یوں غلامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ آخری مصرع میں اقبالؔ خدا سے فریاد کرتے ہیں کہ روزِ مکافات (بدلہ کا دن) کب آئے گا۔

اے خدا! بیشک تو دشمنوں کو ڈھیل دیتا ہے (دیر گیر ہے) لیکن

اب تو کشمیری مسلمانوں کی ذلّت اور مصیبت کی انتہا ہو گئی۔ اب تو اُن کو غلامی سے نجات دے اور انہیں موقع عطا فرما کہ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکیں۔

۴

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چار سوو رنگ و بو
پاک ہوتا ہے ظن و تخمین سے انساں کا ضمیر
کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو
وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو
ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بتِ سنگین دل و آئینہ رو

تمہید۔۔ اس نظم میں اقبالؔ نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ جب غلامی کی ذلّت اور مصیبت سہتے سہتے غلام قوم زندگی سے عاجز آجاتی ہے تو اس کے اندر آزادی کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس قوم کے افراد کا خون تاؤ کھانے لگتا ہے یعنی جب وہ حکمرانوں کے ظالمانہ طرزِ عمل کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ان کے اندر انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

رفتہ رفتہ ان کا دل (ضمیر) ہر قسم کے ذہنی وسواس اور شکوک (ظن و تخمین) سے پاک ہو جاتا ہے یعنی وہ اپنے لئے طریقِ عمل متعین کر لیتے ہیں یا ایک

پروگرام وضع کر لیتے ہیں جس میں ظن وتخمین کے بجائے حقائق کا جلوہ نظر آتا ہے۔ یعنی وہ خیالی دُنیا سے نکل کر عملی دُنیا میں آجاتے ہیں اور اُن کے اندر حصولِ آزادی کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اِس قوم کے افراد میں جو دیرینہ عیوب (چالاکی) ہوتے ہیں جن کو عقل دُور نہیں کر سکتی، وہ سب آزادی کے جذبہ (عشق) کی بدولت دُور ہو جاتے ہیں (عشق اُن سب پُرانے چالاکوں کو سوئی کے لیے غیرمی دیتا ہے) یعنی سُستی، کاہلی، تن آسانی، عیش پسندی، عافیت طلبی اور راحت کوشی یہ سب خرابیاں اور برائیاں دُور ہو جاتی ہیں۔ آزادی کا جذبہ افراد کو ان تمام عیوب سے پاک کر دیتا ہے۔

جب یہ بات پیدا ہو جاتی ہے تو افراد یک دل، یک جان اور یک آہنگ ہو کر باطل کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی ضربِ پیہم سے ملوکیت کا بُت پاش پاش ہو جاتا ہے۔

نوٹ:۔ اقبال نے یہ نظمیں ۱۹۳۶ء میں یعنی آج سے پندرہ سال پہلے لکھی تھیں اور یہ توقع ظاہر کی تھی کہ اس قوم کی غلامی کا دور بھی ختم ہونے والا ہے۔ لیکن افسوس ان کی یہ توقع پوری ہوتی نظر نہیں آتی ۱۸۴۶ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل۔ لارڈ ہارڈنگ، نے کشمیر کے مسلمانوں کو پچھتر لاکھ کے عیوض ڈوگروں کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا ....

....

....

....

۵

درّاج کی پرواز میں ہے شوکتِ شاہیں
حیرت میں ہے صیادِ یہ شاہیں ہے کہ درّاج!
ہر قوم کے افکار میں پیدا ہے تلاطم
مشرق میں ہے فردائے قیامت کی نمود آج
فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور
وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

مطلب:۔ اِس نظم میں اقبال نے حصولِ آزادی کی اُس تحریک کی طرف اشارہ کیا ہے جو ۱۹۳۰ء میں کشمیری مسلمانوں کے اندر پیدا ہوئی تھی۔ اِس تحریک کی بنا پر، اِس مظلوم اور محکوم قوم کے افراد میں باطل کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا ہو گئی یعنی تیتر کی زندگی میں شاہین کا رنگ پیدا ہو گیا۔ یہ انقلاب دیکھ کر کشمیر کا حکمران طبقہ (صیاد) حیران ہو گیا کہ یہ وہی کشمیری مسلمان ہیں جو ہماری غلامی پر قانع تھے یا ان کی جگہ کوئی اور قوم پیدا ہو گئی ہے؟

کہتے ہیں کہ کشمیری مسلمان اپنی آزادی کے لئے جو کوشش کر رہے ہیں۔ یہ عین فطرت کے مطابق ہے۔ خدا نے انسان کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ وہ انسانوں کی غلامی کرے۔ غلامی تو فطرتِ انسانی کے خلاف ہے اس لئے کوئی تعجب یا حیرانی کی بات نہیں ہے اگر کشمیر کے وہ مسلمان جو صدیوں سے غلامی کی زندگی بسر رہے تھے۔ آج اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اِس صدی کے آغاز تک کشمیر کے مسلمان سیاسی اعتبار

سے بالکل مُردہ تھے۔ اِن کے اندر آزادی کی کوئی تڑپ نہیں تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سکھوں اور ڈوگروں نے گذشتہ صدی میں اُن پر اِس قدر مظالم روا رکھے اور ان کی رُوحِ آزادی کو اس قدر کچل دیا کہ وہ بالکل مُردہ ہو گئے تھے۔ لیکن قانونِ فطرت ہے کہ کوئی قوم ہمیشہ غلام نہیں رہ سکتی۔ اِس لئے اب اِن کے اندر آزادی کے حصول کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔

۶

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات
ہر چند کہ مشہور نہیں ان کے کرامات
خود گیری و خودداری و گلبانگِ انا الحق
آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اُس کا ہمہ اوست،
خود مردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات!

مطلب:۔ اِس دلپذیر نظم میں اقبال نے ہمیں اس بُنیادی حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ حرّیت، رُوحانی ترقی کے لئے بمنزلہ سنگِ بنیاد ہے اگر سالک میں حرّیت کا ملہ پیدا نہیں ہوئی ہے تو وہ کسی قسم کی رُوحانی ترقی نہیں کر سکتا۔ اگر اس کی رُوح غلامی سے مضمحل ہو چکی ہے تو مراقبے اور مجاہدے سب بے سود ہیں۔ اِس نکتہ کو میں ایک مثال میں واضح کرتا ہوں۔

فرض کیجئے زید ضعفِ جگر میں مبتلا ہے۔ اندریں حالت اگر اس کو مقوی غذائیں کھلائی جائیں تو نفع کے بجائے نقصان ہوگا۔ اِس کو طاقتور بنانے کا

کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اِس کے مرض کا علاج کیا جائے جب ضعفِ جگر دُور ہو جائے گا تو مقوی غذائیں یقیناً اُسے فائدہ پہنچا سکیں گی۔

اِسی طرح جس شخص کے اندر حرّیت کا رنگ نہیں ہے یعنی جس شخص کی رُوح غلامی کے مرض میں مبتلا ہے اِس کو مجاہدوں اور مراقبوں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اِسی لئے اسلام نے اِنسان کو حرّیتِ کاملہ کی نعمت سے سرفراز کیا ہے تاکہ وہ رُوحانیت میں ترقی کر سکے۔ حرّیتِ کاملہ سے میری مراد حرّیتِ سہ گانہ ہے۔

واضح ہو کہ حرّیت کی تین قسمیں ہیں (۱) حرّیتِ نفس (۲) حرّیتِ عقل (۳) حرّیتِ ضمیر اور اسلام نے انسان کو حرّیت کی اِن تینوں اقسام سے بہرہ ور کیا ہے۔

(۱) حرّیتِ نفس سے میری مراد یہ ہے کہ کسی انسان کو کسی انسان پر حکومت کا حق حاصل نہیں ہے۔ اِسلام کی رُو سے کوئی اِنسان، دوسرے اِنسانوں کو اپنا غلام نہیں بنا سکتا۔ ہر شخص ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوتا ہے اور آزادی ہر اِنسان کا پیدائشی حق ہے۔ اسلام نے انسان کی اِس آزادی کو تسلیم کیا ہے اِس لئے ملوکیت کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ ملوکیت میں شخصی آزادی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ قرآنِ مجید فرماتا ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط اللہ کے سوا کوئی حکمران نہیں ہے (۶: ۵۷) وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ط اور حکومت اُسی کو سزاوار ہے اور تم سب کا انجام کار اُسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے (۲۸: ۷۰) فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ط پس حکومت تو اللہ کی ہے جو بڑی

شان اور عظمت والا ہے (۴۰ : ۱۱)

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا اور اللہ اپنی حکومت میں کسی کو اپنا شریک نہیں بناتا۔ یعنی کائنات پر حکومت صرف اسی کی ذات سے مختص ہے (۱۸ : ۲۶)

(۲) حریتِ عقل سے میری مراد یہ ہے کہ انسان کو علم حاصل کرنے کی آزادی حاصل ہے اور حصولِ علم کے سلسلہ میں اپنی عقلِ خداداد سے کام لینے کی آزادی حاصل ہے دنیا میں کوئی شخص اس کو عقل کے استعمال سے باز نہیں رکھ سکتا۔ قرآنِ حکیم نے انسان کے اس حق کو بھی تسلیم کیا ہے بلکہ دنیا میں اور کسی مذہبی کتاب نے اس شدت کے ساتھ اس کو اپنی عقل سے کام لینے کی دعوت نہیں دی

جب انسان کسی معاملہ میں اپنی عقل سے کام لیتا ہے تو کبھی وہ تعقل کرتا ہے، کبھی تفکر، کبھی تدبر اور کبھی تفقہ قرآنِ حکیم کا کمال ملاحظہ ہو کہ اس کتابِ حکیم نے اپنی دعوت میں انسان کی قوتِ مدرکہ کے ان چاروں مظاہر کو مدِ نظر رکھا ہے۔

(۱) لَوْ يُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۲ : ۷۳)

اور اللہ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم تعقل کر سکو یعنی اپنی عقل سے کام لے کر اس کی ہستی پر ایمان لا سکو۔

(ب) كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ (۲ : ۲۱۹)

اس طور سے اللہ تمہارے سامنے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم تفکر کر سکو یعنی اپنی فکر سے کام لے کر قرآن کی حقانیت پر ایمان لا سکو۔

(ج) أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۴ : ۸۲) پس یہ لوگ (منکرین) قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے، اگر وہ تدبر سے کام لیں تو یہ صداقت ان پر منکشف ہو جائے گی کہ اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا یعنی کسی انسان کا بنایا ہوا ہوتا تو وہ اس میں بہت سے اختلاف پاتے۔

(د) قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ (۶ : ۹۸)

بلاشبہ ہم نے اپنی آیات تفصیل کے ساتھ بیان کر دی ہیں تاکہ وہ تفقہ کر سکیں یعنی ان میں غور و فکر کر کے ہم پر ایمان لا سکیں۔

اب میں اس بات کا فیصلہ ناظرین پر چھوڑتا ہوں کہ دنیا میں کسی کتاب نے انسان کو اپنی عقل سے کام لینے کی دعوت اس سے زیادہ مؤثر انداز میں دی ہے۔

(۲) حریتِ ضمیر سے میری مراد یہ ہے کہ انسان کو آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی سمجھ سے کام لے کر جو راستہ اپنے لئے مناسب سمجھے اختیار کرے کوئی شخص اس کو اس کی مرضی کے خلاف کسی بات پر ایمان لانے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا صرف ایک آیت درج کرتا ہوں۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲ : ۲۵۶)

دین کے معاملہ میں کسی پر جبر نہیں ہے اس لئے ہدایت، گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں اب اسے اختیار ہے جو راستہ چاہے اختیار کر لے۔

اس تفصیل سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ اسلام نے انسان کو سیاسی غلامی ہی سے نجات نہیں دی بلکہ ہر قسم کی غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ اسی ابلیس نے اپنی مجلس شوریٰ میں یہ کہا کہ اسلام تو غلامی کی ہر نوع کے لئے موت کا پیغام ہے۔

یورپ انقلابِ فرانس پر بہت فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس انقلاب کی بدولت مغربی دنیا آزادی سے ہمکنار ہوئی۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس انقلاب سے یورپ کو صرف سیاسی آزادی کا سبق ہوا۔

عقل اور ضمیر کی آزادی اس انقلاب کے بانیوں کے تصور میں بھی نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ فرانس کو بادشاہوں کی غلامی سے تو آزادی نصیب ہو گئی مگر پوپ کی غلامی سے نجات آج تک حاصل نہیں ہوئی ہے ان کی عقل اور ان کا ضمیر اسی طرح غلامی کی لعنت میں گرفتار ہے۔ یہ نعمت تو صرف اسلام کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔ دنیا میں صرف اسلام ہی وہ دین (دستورِ حیات) ہے جس نے ان تمام طریقوں کو باطل کر دیا جن کی بدولت کوئی شخص بنی آدم کو حریتِ کاملہ سے محروم کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ملوکیت بادشاہی شہنشاہی، استعماریت، جاگیرداری، سرمایہ داری، رہبانیت، احبارییت، کلیسائیت) مذہبی پیشوائیت، ملائیت، تجسیم، حلول، کفارہ، اسلاف پرستی، آثار پرستی، قبر پرستی، صلیب پرستی، اولیا پرستی، شخصیت پرستی یعنی انسانوں کو غلام بنانے اور ان کو حریتِ کاملہ سے محروم کرنے کی ان تمام صورتوں کو یکسر مردود و مذموم ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب میں اس نظم کا مطلب لکھتا ہوں۔

پہلے شعر میں طنز اور ظرافت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ صوفیوں کی کرامات کا تو مجھے علم نہیں ہے (کیونکہ وہ مشہور نہیں ہیں) لیکن ان کے کمالاتِ روحانی کا علم تو ہم جیسے رندوں کو بھی ہے، لہٰذا ان کی تفصیل برائے شائقین کی جاتی ہے۔

اگر سالک (صوفی) حریتِ کاملہ سے متمتع ہے اگر وہ آزادی کی فضا میں سانس لے رہا ہے تو اس کے روحانی مدارج (مقامات) حسبِ ذیل ہوتے ہیں:۔

(۱) خودگیری (۲) خودداری (۳) گلبانگِ انا الحق۔

واضح ہو کہ ۱ اور ۲ اقبال کی اصطلاحات ہیں۔

خودگیری سے ان کی مراد یہ ہے کہ سچا مسلمان وہ ہے جو کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے اپنی حفاظت خود کرے۔ خودگرفتن یعنی خود را نگاہ داشتن۔ اپنی حفاظت کے لئے دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ یعنی اپنی زندگی اپنی قوتِ بازو کی بدولت بسر کرے یعنی خودگیری سے مراد ہے۔ اعتماد علی النفس۔ کسی کا دستِ نگر نہ ہونا۔ خودداری سے مراد ہے اپنی خودی کی عزت کرنا اور اگر کوئی توہین کرے تو اس کا تدارک کرنا۔ اور کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے خودی ذلیل ہو جائے۔

نوٹ:۔ بدایوں (یوپی) کے کلکٹر نے ۱۸۹۵ء میں قاضی شہر سے جیل خانہ کی کوٹھڑی میں یہ کہا کہ کل جب آپ کو میرے سامنے پیش کیا جائے تو آپ یہ کہہ دیں کہ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ دستخط جو جہاد کے فتویٰ پر ثبت ہیں، در حقیقت میرے ہی ہیں۔ اور میرے ہی قلم سے ہیں یا مجھے یاد نہیں کہ میں نے استفتاء کے جواب میں انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کو فرض قرار دیا ہو یا فرضیت کا

فتویٰ دیا ہو۔ تاکہ میں آپ کو بری کر دوں۔ آپ میرے اُستاد ہیں میں ہرگز ہرگز اِس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ میں اپنے قلم سے پھانسی کا حکم صادر کردوں۔ اِس کے جواب میں مولوی صاحب نے کہا کہ بدآتوں کے سارے ہندو مسلمان جانتے ہیں کہ میں نے جہاد کی فرضیت کا فتویٰ دیا تھا۔ اگر میں عدالت میں یہ بیان دوں تو جان تو بچ جائے گی۔ لیکن دُنیا کی نگاہ میں یقیناً ذلیل ہو جاؤں گا۔ مجھے پھانسی قبول ہے لیکن خودی کی تذلیل گوارا نہیں کر سکتا۔

یہ ہے اقبالؔ کا مفہوم خودداری کہ مسلمان موت قبول کرے لیکن خودی کی ذلت کسی حالت میں گوارا نہ کرے۔

قصہ مختصر یہ کہ سالک اگر حریت کی نعمت سے مالا مال ہے تو پھر اس کی رُوحانی ترقی کی منازل یہ ہوتی ہیں کہ وہ خودگیر ہوتا ہے خوددار ہوتا ہے۔ اور انجام کار انا الحق کا نعرہ بلند کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا اِس کائنات میں دوسری ہستی موجود نہیں ہے صرف ذاتِ واحد ہی موجود ہے اور میں اُس ذاتِ واحد کی صفتِ خالقیت کا کرشمہ ہوں۔ بذاتِ خود مخلوق تو ہوں لیکن مظہرِ ذاتِ حق ہوں۔ اِس لئے حق ہوں۔

انا الحق وہ مقام ہے جب سالک اپنی ذات کو ذاتِ حق میں بکلی فنا کردیتا ہے اور اُس وقت یہ حقیقت اُس پر منکشف ہو جاتی ہے کہ لا موجود الّا اللہ۔ یعنی اللہ کے سوا اور کوئی ہستی اس کائنات میں موجود نہیں ہے۔ اِس حالت میں اگر سالک اپنے آپ کو حق سے تعبیر کرتا ہے تو اس کی مثال یہ ہے کہ جب لوہا آگ میں پڑ کر اپنی ہستی کو فنا کر دیتا ہے تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ ذرا دیکھو تو!

یہ لوہے کا ٹکڑا تو بالکل آگ ہو گیا۔ بس اسی طرح سالک کا اپنا وجود تو فنا ہو جاتا ہے حق ہی حق باقی رہ جاتا ہے۔ اس حالت میں اگر کسی عارف کی زبان سے انا الحق نکل جائے تو وہ غلط نہیں ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ غیر اللہ کا وجود ثابت نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ حسین منصور حلاج نے انا الحق کہہ کر اسی حقیقت کا اعلان کیا تھا جس کا اعلان شیخ اکبرؒ، عارف رومیؒ، مولانا جامیؒ، شیخ عراقیؒ، حضرت مجدد الفِ ثانیؒ حضرت مجدد دہلویؒ اور اِن سب کے خوشہ چیں اقبالؔ مرحوم نے کیا ہے۔ یعنی خودی کی تلاش کرو گے تو خدا مل جائے گا۔ اور خدا کی تلاش کرو گے تو خودی مل جائے گی۔ دریا اور موج دریا میں صرف نام ہی کا تو فرق ہے۔

لیکن اگر سالک غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے، یا اگر غلامی پر رضامند ہے اور انگریزوں کی حکومت کو مسلمانوں کے لئے رحمت قرار دیتا ہے تو پھر وہ کسی قسم کی رُوحانی ترقی نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ اگر وہ الہام کا مدعی ہے تو اربابِ بینش کی نظر میں اس کی بھی کوئی قدر و منزلت نہیں ہو سکتی، چنانچہ اقبالؔ خود کہتے ہیں:۔

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

غلامی کی بدولت سالک کی خودی مُردہ ہو جاتی ہے بلکہ یہ بیماری ہم اس کے حق میں "ہمہ اوست" کا مصداق بن جاتی ہے یعنی اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خود مر جاتا ہے، اور مر کر خودی اپنا مرقد بن جاتی ہے اور خودی اپنی ناگہانی موت کا سبب ہو جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سالک اگر آزاد ہے تو اُس کا ہمہ اوست یہ ہے کہ

میں حق ہوں۔ اور اگر وہ غلام ہے تو اس کا ہمہ اوست یہ ہے کہ میں مُردہ ہوں۔ دونوں مسلک ہمہ اوست کے قائل ہوتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ آزاد کا مسلک اُسے زندگی سے ہمکنار کر دیتا ہے اور محکوم کا مسلک اُس پر موت وارد کر دیتا ہے۔

نوٹ:۔ واضح ہو کہ دراصل غلام یا محکوم مسلک ہمہ اوست کا قائل نہیں ہوتا کیونکہ یہ حالت اس پر کبھی وارد ہی نہیں ہو سکتی۔ اقبالؔ نے یہ اصطلاح محض طنزاً استعمال کی ہے جس سے اِن کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ غلام یا محکوم شخص کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ غیر اس کی موت کا سبب نہیں ہوتا بلکہ وہ خود اپنی موت کا سبب ہوتا ہے اور اُسی پر موت وارد ہوتی ہے۔ اور اس رُوحانی موت کے بعد خود اس کی شخصیت ہی اِس کی قبر بن جاتی ہے۔ جس طرح "ہمہ اوست" کی رُو سے شہود و شاہد اور مشہود تینوں ایک ہیں۔ اُسی طرح غلامی میں غلام ہی مرتا ہے اور وہ خود اپنی موت کا سبب ہوتا ہے۔ اور خود ہی اپنی قبر بن جاتا ہے۔

پہلا شعر:۔ اے مسلمان! تیرے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اب تو اپنے اندر انقلاب پیدا کر یعنی خانقاہوں سے نکل کر باطل کے مقابلہ میں صف آرا ہو جا۔ کیونکہ خانقاہوں میں تو جس فقر کی تعلیم حاصل کر رہا ہے اس کا نتیجہ مایوسی ناکامی اور رنج و غم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

دوسرا شعر:۔ تیرے دماغ میں دینِ اسلام کا غلط مفہوم جاگزیں ہو گیا ہے یعنی تو یہ سمجھتا ہے کہ اسلام، ترکِ دُنیا کا نام ہے، اور یہی وجہ ہے۔ کہ تو اپنی تصانیف میں بھی اسلام کو ترکِ دُنیا (رہبانیت) کے رنگ میں پیش کر رہا ہے۔ میں تجھے متنبہ کرتا ہوں کہ جب کسی قوم کے خاتمہ کا وقت آجاتا ہے تو اس کے افراد میں ترکِ دُنیا کا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔

نوٹ:۔ اِس شعر میں اقبالؔ نے موجودہ زمانہ کے علماء اور صوفیاء کی ذہنیت کا نقشہ پیش کیا ہے۔ عرصۂ دراز سے اکثر و بیشتر علماء اور صوفیاء کے دلوں میں دین کا یہ مفہوم جاگزیں ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کو نماز روزہ کے مسائل بتا دیئے جائیں یا کفر کے فتووں پر مہریں ثبت کر دی جائیں یا شاگردوں کو حدیث اور فقہ کی چند کتابیں پڑھا دی جائیں۔ باقی رہے مسلمانوں کے قومی یا سیاسی یا تمدنی مسائل تو یہ سب باتیں دُنیا سے تعلق رکھتی ہیں، دین سے اِن کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اِس لئے ہمیں اِن معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

رموزِ سلطنتِ خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

۔۔۔

۶

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آرہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالمِ پیری
شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری
چہ بے پروا گذشتند از نوائے صبحگاہِ من
کہ برد آں شور و مستی از سیہ چشمانِ کشمیری؟

تیسرا شعر:۔ اے مسلمان! یہ وقت بہت نازک ہے۔ ملوکیت (غیر اسلامی حکومت) کے علمبردار تجھ کو ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنانے کی تدابیر میں مصروف ہیں اور یہ شیاطین اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ایسے حربے استعمال کر رہے ہیں جو بظاہر دلفریب ہیں اور تو ان کو اپنے حق میں مفید سمجھتا ہے۔

لیکن درحقیقت یہ سب تجھے غلام بنانے کی خوشنما صورتیں ہیں۔ وہ لوگ دراصل تیرے دشمن ہیں لیکن دوستوں کی شکل میں تیرے سامنے آرہے ہیں۔ وہ تجھے مالی امداد دے رہے ہیں تیرے رہنماؤں کو ترقی کے راستے سجھا رہے ہیں۔ تیرے پاس خیر سگالی کے وفود بھیج رہے ہیں لیکن درحقیقت یہ سب تجھے غلام بنانے کی ترکیبیں ہیں۔ پس تو آنکھیں کھول اور اپنے بچاؤ کی فکر کر۔[1]

چوتھا شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے اس امر پر اظہار افسوس کیا ہے کہ میرے ملک کے باشندوں نے میرے پیغام کو مطلق نہیں سمجھا۔ بلکہ سمجھنے کی

---

[1] ملوکیت کے علمبردار (امریکہ اور انگلستان) کی عیاری کی تازہ ترین مثال یہ ہے کہ آج کل یہ شیطان اسلام مسلمانوں کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ اگر تم کمیونسٹ روس سے خائف ہو سکتے ہو تو خدا پرست کیوں نہیں ہو سکتے؟ پس تم بھی خدا پرست ہو ہم بھی خدا پرست ہیں اس لئے روس کے مقابلہ میں ہمارے ساتھ متحد ہو جاؤ، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ روس خدا پرست ہے نہ یہ لوگ خدا پرست ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ روس اعلانیہ منکر ہے اور یہ لوگ زبان سے اقرار کرتے ہیں لیکن اپنے عمل سے خدا کا انکار کرتے ہیں۔ اور میری رائے میں روس نے مسلمانوں کو اس قدر نقصان نہیں پہنچایا جس قدر انگریزوں نے۔"

کوشش ہی نہیں کی۔

اے خدا! کشمیری مسلمانوں کے دل اسلام کی محبت سے کس طرح خالی ہوگئے۔

۸

سمجھا لہو کی بوند اگر تو اسے تو خیر
دل آدمی کا ہے فقط اک جذبۂ بلند
گردش مہ و ستارہ کی ہے ناگوار اسے
دل آپ اپنے شام و سحر کا ہے نقشبند
جس خاک کے ضمیر میں ہے آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

مطلب:۔ اس نظم میں اقبال نے کشمیری مسلمانوں کو دل کی ماہیت اور قدر و قیمت سے آگاہ کیا ہے کہتے ہیں کیا اے مسلمان! اگر تو دل کو گوشت کا لوتھڑا سمجھتا ہے تو یہ تیری نادانی ہے۔ دل سے مراد عضو نہیں ہے جو خون کی گردش کا سبب ہے بلکہ دل ایک نورانی لطیفہ ہے یعنی ایک غیر مادی جوہر ہے جس کی بدولت انسان کے اندر تسخیر کائنات کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے یعنی دل سے خودی مراد ہے جو زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے۔

مادی دنیا میں صبح و شام بیشک شمس و قمر کی گردش سے متعلق ہوتی ہے لیکن انسان کی روحانی دنیا، ان مادی قوانین کی پابند نہیں ہے۔ اس دنیا میں جس قدر انقلابات رونما ہوتے ہیں وہ سب دل ہی کی کیفیات سے پیدا ہوتے ہیں!

یاد رکھو کہ جس انسان کے دل میں عشقِ رسول کی آگ روشن ہے وہ شخص غلامی

کی زندگی گوارا نہیں کرسکتا۔

نوٹ:۔ اس شعر میں اقبال نے آتشِ چنار کی ترکیب بہت برمحل استعمال کی ہے کیونکہ کشمیر میں چنار کا درخت بکثرت پایا جاتا ہے اور چونکہ اس کی لکڑی میں روغن ہوتا ہے اس لئے وہ بہت جلد جل اٹھتی ہے اور اس کی لپٹ بہت تیز ہوتی ہے اقبال نے "آتشِ چنار" سے عشقِ رسول کی آگ مراد لی ہے اور عشق کی خاصیت بھی یہی ہے کہ اس کی آگ بھی بہت شدید ہوتی ہے اور حوادثِ روزگار سے ٹھنڈی نہیں ہوسکتی۔

۹

کھلا جب چمن میں کتب خانۂ گل
نہ کام آیا مُلّا کے علمِ کتابی
متانت شکن تھی ہوائے بہاراں
غزل خواں ہوا پیرکِ اندرابی
کہا لالۂ آتشیں پیرہن نے
کہ اسرارِ جاں کی ہوں میں بے حجابی
سمجھتا ہے جو موت خوابِ لحد کو
نہاں اس کی تعمیر میں ہے خرابی
نہیں زندگی سلسلہ روز و شب کا
نہیں زندگی مستی و نیم خوابی
حیات است در آتشِ خود طپیدن
خوش آں دم کہ ایں نکتہ را بازیابی

اگر ز آتشِ دل شرارے بگیری
تواں کرد زیرِ فلک آفتابی

تمہید:۔ یہ اس مجموعہ میں بہترین نظم ہے۔ اس میں اقبال نے پہلے تو مُلّا کی کوتاہی کو واضح کیا ہے کہ وہ سارا وقت کتابوں کے مطالعہ میں بسر کرتا ہے۔ مشاہدۂ فطرت کی طرف قطعاً متوجہ نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نہ اس کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے نہ دل میں عشقِ الٰہی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور نہ وہ کائنات اور زندگی کی حقیقت سے آگاہ ہوسکتا ہے۔

"پیرکِ اندرابی" یہ ترکیب قدرے تشریح طلب ہے۔ اندرابی منسوب ہے اندرآب سے جو بلخ کے پاس ایک قصبہ تھا۔ یہاں سے سادات کا ایک بلند مرتبہ خاندان جس کے افراد علم اور زہد دونوں میں ممتاز تھے، ہجرت کرکے وادیٔ لولاب میں آکر آباد ہوگیا تھا۔[1] اس خاندان کے افراد حسب و نسب اور علم و فضل کے اعتبار سے آج بھی مسلمانانِ کشمیر میں معزز اور ممتاز ہیں۔

لالۂ آتشیں پیرہن۔ گلِ لالہ، اقبال کی اصطلاح ہے اور ان کی شاعری میں رمزیہ اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ چونکہ عاشق کی طرح لالہ کے جگر میں بھی داغ ہوتا ہے۔ اس لئے اقبال اس کو عاشق کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ اور اسی لئے

---

[1] میرے استاد محترم حضرت مولانا مولوی سید محمد میرک شاہ صاحب مدظلہ العالی جو معقول اور منقول دونوں شعبوں میں نہایت بلند مرتبہ رکھتے ہیں، سادات اندرابیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے اسلاف کی تمام خصوصیات کے حامل ہیں۔"

انہوں نے اس کی زبان سے زندگی کی حقیقت بیان کی ہے۔ کیونکہ اقبالؔ کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی کی حقیقت سے صرف عاشق ہی آگاہ ہو سکتا ہے:۔

بچشمِ عشق نگر تا سراغ خود یابی
جہاں بچشمِ خرد سیمیا و نیرنگ است

اقبالؔ نے اس بات کو مختلف طریقوں سے ثابت کیا ہے کہ منطقی یا فلسفی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا کیونکہ عقل میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ جس بات کو ثابت کرتی ہے تھوڑی دیر کے بعد خود ہی اس کو باطل کر دیتی ہے مثلاً اگر آج وہ اس بات پر دلیل پیدا کرتی ہے کہ خدا موجود ہے تو کل وہی عقل یہ دلیل قائم کرتی ہے کہ خدا موجود نہیں ہے۔ منطقی یا فلسفی ساری عمر خود ہی اثبات واجب الوجود پر ادلّہ قائم کرتا ہے اور خود ہی انکار کرتا رہتا ہے اس اثبات و ابطال کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تادمِ مرگ اس کو یقین (ایمان) حاصل نہیں ہو سکتا۔

اقبالؔ نے اپنی تصانیف میں زندگی کی حقیقت مختلف طریقوں سے واضح کی ہے۔ کہیں تو یہ کہا ہے:۔

ع سرِ آدم ہے ضمیرِ "کن فکاں" ہے زندگی

اور کہیں یہ لکھا ہے۔

بر مقامِ خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

اور کہیں اُسے ان لفظوں سے واضح کیا ہے:۔

زندگی جز لذتِ پرواز نیست   آشیاں با فطرتِ او ساز نیست

اور کہیں اس کی تصویر اس انداز سے کھینچی ہے:۔

آنکہ حیٔ لایموت آمد حق است
زیستن با حق حیاتِ مطلق است

لیکن ان تمام تعبیرات کا مفہوم ایک ہی ہے۔ چنانچہ یہاں اس کو اس طریقہ سے ادا کیا ہے:۔

حیات است در آتشِ خود تپیدن
خوش آں دم کہ ایں نکتہ را باز یابی

یہ شعر اس نظم کی جان ہے اور اسی کے لئے اقبالؔ نے چمن کا تلازمہ بلدھا اور پانچ اشعار بطور تمہید لکھے مقصد اس نظم سے یہ ہے کہ اگر کشمیری مسلمان عقل کے بجائے عشق کو اپنا رہنما بنالیں تو غلامی کی زنجیروں کو توڑ سکتے ہیں۔

مطلب:۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ جب مُلّا باغ میں گیا تو وہ پھولوں کے کتبخانہ سے مطلق استفادہ نہ کر سکا۔ بلکہ وہ اس لائبریری کی ایک کتاب بھی نہ پڑھ سکا۔ بات یہ ہے کہ کتابی علم فطرت کے مطالعہ میں کچھ بھی مدد نہیں کرتا۔ مطلب یہ ہے کہ مُلّا میں کائنات کے مطالعہ کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اس لئے نہ وہ فطرت کا مشاہدہ کر سکتا ہے اور نہ اُس سے، اس کے اندر معرفتِ الٰہی کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے۔

جب مُلّا نے کچھ دیر تک باغ میں قیام کیا تو اس پر بھی موسمِ بہار نے اپنا اثر مرتب کیا یعنی اس کے اندر بھی غزلخوانی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

جب گُل لالہ نے یہ کیفیت دیکھی تو اُس نے کہا کہ میں تجھ پر زندگی کی

حقیقت واضح کر سکتا ہوں مطلب یہ ہے کہ عاشق اسرارِ حیات سے واقف ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کسی کے دل میں ان حقائق سے آگاہی حاصل کرنے کی تمنا ہو تو اُسے عشق اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ دولت کتابی علم سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ گُل لالہ نے کہا کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی نہیں ہو گی، اس کا خیال غلط ہے اور اس درجہ غلط ہے کہ اس نظریہ پر جو معاشرہ قائم ہو گا، اس کو کبھی استحکام نصیب نہیں ہو سکتا۔ یعنی جو سوسائٹی مسلکِ مادیت پر قائم ہو گی، اخلاقی اعتبار سے اس کا وجود دُنیا کے لئے ہزاروں خرابیوں کا موجب ہو گا۔ عقیدۂ انکارِ خدا پر، کوئی پائدار نظامِ زندگی مدون نہیں ہو سکتا۔

زندگی، عناصر میں ظہورِ ترتیب کا نام نہیں ہے، زندگی، زمان و مکان میں مقید نہیں ہے کیونکہ وہ ذاتِ مادی کے امتزاج کا نتیجہ نہیں ہے، زندگی حیوانات کی طرح خواب و خورش سے عبارت نہیں ہے۔

نوٹ:۔ اس مصرع میں دو لفظ آئے ہیں مستی اور نیم خوابی پہلے لفظ سے اقبالؔ نے فرائڈ کے نظریہ کا ابطال کیا ہے کہ انسانی زندگی محض جنسی خواہشات (انہی سے مستی کا رنگ پیدا ہوتا ہے) یا ان کی تسکین کا نام نہیں ہے۔

دوسرے لفظ سے مارکس کے فلسفہ کی تردید کی جاتی ہے کہ انسانی زندگی صرف شکم پُری (اسی سے نیم خوابی کی کیفیت رونما ہوتی ہے) سے عبارت نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو تو انسان اور گدھے میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں میں بُعد المشرقین ہے"۔

پہلے گُل لالہ نے یہ بتایا کہ زندگی کیا نہیں ہے یعنی مروجہ غلط نظریات

(مادیت اور اشتراکیت) کی تردید کی اس کے بعد اب بتاتا ہے کہ زندگی کیا ہے چنانچہ کہتا ہے کہ

زندگی درحقیقت اپنی آگ میں جلنے کا نام ہے اور یہ آگ صرف عشق کی بدولت سینہ میں روشن ہو سکتی ہے یعنی زندگی، کسی نصب العین کے حصول میں ہر وقت ساعی رہنے کا نام ہے[1]۔ اقبالؔ کی رائے میں زندگی کا اطلاق صرف اس شخص پر ہو سکتا ہے جو اپنے مقصود کو حاصل کرنے کے لئے ہر وقت جد و جہد میں مصروف رہے اسی مسلسل سعی پیہم اور تگاپوئے مدام کو اقبالؔ اپنی آگ میں جلنے سے تعبیر کرتے ہیں چونکہ یہ "طپیدن مدام" ہی اصل حیات ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ بڑا مبارک ہو گا وہ وقت جب تو اس نکتہ کو سمجھ جائے گا۔ کہ زندگی اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کی لگن کا نام ہے۔

آخر میں کہتے ہیں کہ اے مسلمان! اگر تو اپنے دل میں محبت کی چنگاری روشن کر سکے یعنی اگر تیرے دل میں نصب العین کے حصول کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو جائے (اسی کو عشق کہتے ہیں) تو میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تو اس دُنیا میں "آفتابی" کر سکتا ہے۔ اس آفتابی کرنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ تیرا وجود، دُنیا کے حق میں ایسا ہی مفید ہو جائے گا جیسا کہ آفتاب کا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ تو

---

[1] اقبالؔ نے اسی نکتہ کو بالِ جبریل میں بایں الفاظ بیان کیا ہے۔

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام   سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگی کا انگبیں

اس شعر میں شباب سے زندگی مراد ہے۔ ۱۲

دنیا میں سب سے اعلیٰ مرتبہ حاصل کر سکے گا۔ جیسا کہ آفتاب کو حاصل ہے۔ آفتابی میں شہرت، عزت، چمک دمک، ناموری، بلندی، یکتائی اور سروری یہ تمام تصورات پوشیدہ ہیں۔

نوٹ:۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ حیات، اپنی خودی کی آگ میں جلنے کا نام ہے، میں واضح کر چکا ہوں کہ یہ آگ عشق سے پیدا ہوتی ہے بلکہ عشق ہی کا دوسرا نام آگ ہے۔ حضراتِ صوفیہ کی بھی یہی تعلیم ہے۔ صرف اصطلاحات کا فرق ہے یعنی وہ اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ زندگی، سلوکِ مطلقہ کا نام ہے، اور جو شے سالک کے اندر سلوکِ مطلقہ کا داعیہ پیدا کرتی ہے وہ عشق ہی تو ہے۔ اس سلوک کا طریقہ یہ ہے کہ سالک کائنات کے بجائے اپنی خودی میں غور و فکر کرتا ہے یعنی اپنی خودی کو اپنے روحانی سفر کا نقطۂ آغاز بناتا ہے خودی کے اس مراقبہ کو اقبالؔ اپنی اصطلاح میں "دل آتش خود پیدن" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبالؔ اور صوفیہ دونوں کی تعلیم کا ماخذ قرآنِ مجید کی یہ آیت ہے۔

وَفِي أَنْفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ؟ اور ہم نے اپنی ہستی کی نشانیاں خود تمہارے نفوس میں پوشیدہ کر دی ہیں۔ پس تم غور کیوں نہیں کرتے؟

۱۰

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک
محکوم کا دل مُردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پر سوز و طرب ناک

آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک

مطلب:۔ اس نظم میں اقبالؔ نے آزاد اور محکوم کے درمیان موازنہ کیا ہے، اور مقصد اس سے یہ ہے کہ مسلمانوں میں آزادی کے حصول کا صحیح جذبہ پیدا ہو۔ کہتے ہیں کہ

(۱) آزاد یا مردِ حُر کی خودی یا شخصیت پتھر کی طرح سخت اور مضبوط ہوتی ہے۔ اس لئے جو مخالف اس کے سامنے آتا ہے وہ اس کی خودی کی صلابت کی بنا پر پاش پاش ہو جاتا ہے یعنی دشمن، مردِ حُر کو مغلوب نہیں کر سکتا لیکن غلام کی خودی نہایت ضعیف ہوتی ہے، اس لئے وہ اپنے دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اگر کرتا ہے تو مغلوب ہو جاتا ہے۔

(۲) غلامی کی وجہ سے محکوم کا دل مُردہ، افسردہ اور نا اُمید ہوتا ہے یعنی نہ اس کے دل میں تسخیرِ کائنات کا جذبہ پیدا ہوتا ہے نہ سروری کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور چونکہ وہ ذلّت و خواری کی زندگی بسر کرتا ہے اس لئے قدرتی طور پر اس کے دل میں مایوسی اور نا اُمیدی کا غلبہ ہو جاتا ہے، لیکن اس کے برعکس آزاد کا دل زندہ ہوتا ہے۔ اس میں دُنیا کو فتح کرنے کا ولولہ موجزن ہوتا ہے۔ اور وہ مسرّت سے معمور

ہوتا ہے کیونکہ حریت کا لازمی نتیجہ مسرّت ہے۔

(۳) آزادی کی زندگی کا سرمایہ یہ ہے کہ اس کا دل پاکیزہ خیالات کا مرکز ہوتا ہے اور اس کی شخصیت، ہمت اور حوصلہ کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس کے برعکس محکوم کی ساری زندگی رنج و غم اور ماتم میں بسر ہو جاتی ہے وہ مسرّت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

(۴) آزاد کی زندگی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خلوص اور مروّت کارفرما ہوتی ہے وہ دھوکہ فریب اور خود غرضی سے پاک ہوتا ہے دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتا ہے لیکن محکوم ان خوبیوں سے یکسر معرا ہوتا ہے۔

دوسرے مصرع "ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک" کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ محکوم خواہ علم منطق میں کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو یعنی عقل کے اعتبار سے اس کا پایہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو لیکن وہ خلوص اور مروّت سے بیگانہ ہوتا ہے۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اگرچہ محکوم اپنے غیر اسلامی اعمال کی توجیہہ یا حمایت میں منطقی دلائل پیش کر سکتا ہے لیکن وہ لاکھ دلائل پیش کرے آزاد اس کی دلیلوں سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔

(۵) قصہ مختصر یہ ہے کہ محکوم کسی صورت سے بھی آزاد کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دونوں کی زندگی میں بنیادی اختلاف ہوتا ہے یعنی محکوم کائنات کا غلام ہوتا ہے اور آزاد کائنات پر حکمراں ہوتا ہے۔

خواجۂ افلاک اقبالؔ کی اصطلاح ہے اور اس کے مفہوم سے آگاہ ہو جانے کے بعد بندۂ افلاک کا مفہوم خود بخود واضح ہو سکتا ہے۔

خواجۂ افلاک کے لفظی معنی ہیں افلاک کا آقا۔ اقبالؔ کی مراد اس سے وہ شخص ہے جو زمان و مکان کا حکمراں ہو۔

قدیم فلسفہ میں افلاک کو زندہ اور کائنات پر حکمراں تسلیم کیا گیا ہے۔ قدیم زمانہ میں یونانیوں، مصریوں اور عراقیوں کا خیال یہ تھا کہ افلاک کی گردش انسانوں کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اقبالؔ نے قدماء کے اسی عقیدہ کو مدِ نظر رکھ کر خواجۂ افلاک کی اصطلاح وضع کی ہے یعنی وہ شخص جو افلاک کا محکوم ہونے کے بجائے خود ان پر حکمراں ہو۔

اقبالؔ کا فلسفہ یہ ہے کہ صرف مردِ حُر یا مردِ مومن افلاک پر حکمراں ہو سکتا ہے جو شخص غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے، وہ تو افلاک کے غلاموں کا غلام ہے وہ بھلا کیسا ان پر حکمراں ہو سکتا ہے۔

خواجہ افلاک کا حقیقی مفہوم میری رائے میں یہ ہے کہ مومن زمان و مکان پر حکمراں ہوتا ہے اس کے برعکس غلام، اسیرِ زمان و مکان ہوتا ہے اور یہی دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ

ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

۱۱

تمام عارف و عامی خودی سے بیگانہ!
کوئی بتائے یہ مسجد ہے یا کہ میخانہ!
یہ راز ہم سے چھپایا ہے میرِ واعظ نے
کہ خود حرم ہے چراغِ حرم کا پروانہ

طلسمِ بے خبری، کافری و دینداری
حدیثِ شیخ و برہمن فسون و افسانہ
نصیبِ خطہ ہو یارب وہ بندۂ درویش
کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ
چھپے رہیں گے زمانہ کی آنکھ سے کبتک
گہر ہیں آبِ ولر کے تمام یکدانہ

پہلا شعر۔ اِس شعر میں اقبالؔ نے عالمِ اسلامی پر بحیثیت مجموعی تبصرہ کیا ہے کہ اس وقت مراقش سے لے کر ہندوستان تک سارے مسلمان، عالم ہوں یا جاہل (عارف و عامی) اپنی خودی سے بیگانہ ہیں یعنی اِس بات سے بیخبر ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کو اقوامِ عالم میں کیا مرتبہ عطا کیا ہے، اِس بے خبری کا نتیجہ یہ نکلا کہ عالمِ اسلام، مسجد کے بجائے میخانہ میں تبدیل ہو گیا۔

واضح ہو کہ قرآنِ حکیم نے مسلمانوں کو اقوامِ عالم کا سردار بنایا ہے چنانچہ یہ آیتِ شریفہ اس پر شاہد ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ط (۳: ۱۱۰)

اے مسلمانو! تم بہترین قوم ہو جو پیدا کی گئی لوگوں کے لئے۔ تم حکم کرتے ہو نیک کاموں کا اور روکتے ہو بُرے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو، اللہ پر۔ یعنی اے مسلمانو! جتنی قومیں دُنیا میں آج تک پیدا ہوئیں تم اُن سب میں افضل اور اعلیٰ ہو اور تمہاری افضلیت کا سبب یہ ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے روکتے ہو اور تمہارے اندر یہ طاقت اِس لئے پیدا ہوئی کہ تم مومن ہو۔

اس آیت سے دُنیا میں مسلمانوں کا مرتبہ منصب اور مقام روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا یعنی مسلمان قوم کو اللہ تعالیٰ نے اِس لئے پیدا کیا ہے کہ دُنیا میں نیکی کی اشاعت کرے گی اور بدی کو مٹائے گی اور اس میں یہ طاقت ایمان کی بدولت پیدا ہو سکتی ہے۔ اِس سے یہ ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو اپنے اندر یہ طاقت پیدا کرنی چاہئیے۔ کہ وہ دوسروں کو حکم دے سکیں اور اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو وہ اپنے مقام سے گر جائیں گے اور ان کی تخلیق کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ اگر مسلمان اپنی حقیقت سے آگاہ ہوتے تو وہ یقیناً ایمان باللہ پیدا کر کے اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچاتے اور دُنیا پر حکمرانی کرتے لیکن اِن کی حالت یہ ہے کہ وہ محکومی کی زندگی بسر کر رہے ہیں جس سے ثابت ہوا کہ وہ اپنی خودی سے بیگانہ ہیں۔

دوسرے مصرع میں دو لفظ غور طلب ہیں مسجد اور میخانہ۔ مسجد کنایہ ہے اطاعتِ خداوندی سے اور میخانہ کنایہ ہے اطاعتِ غیر اللہ سے یعنی خودی سے بیگانگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اِس وقت تمام مسلمان اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے بجائے غیر اللہ کی اطاعت کر رہے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کی غفلت سے مسجد، میخانہ بن گئی یعنی عالمِ اسلامی، غیر اللہ کی غلامی میں مبتلا ہو گیا۔ مسجد اور میخانہ کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مسجد وہ جگہ ہے جہاں اِنسان اپنی خودی سے آگاہ ہو سکتا ہے اور میخانہ اِس مقام کو کہتے ہیں جہاں انسان اپنی خودی سے بیگانہ ہو جاتا ہے یعنی اس وقت تمام دُنیا کے مسلمان اپنی خودی کی قدر و قیمت سے بیگانہ اور ناآشنا ہیں۔

دوسرا شعر۔ اِس کی ذمہ داری بڑی حد تک قوم کے علماء اور واعظین پر

ہے۔ جنہوں نے مسلمانوں کو اسلام کی رُوح سے آشنا کرنے کی بجائے فروعی مسائل میں اُلجھا رکھا ہے۔

واضح ہو کہ اسلام کی رُوح یا حقیقت یہ ہے کہ وہ اِنسان کو عشقِ اِلٰہی کا درس دیتا ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت اِس پر نصِ صریح ہے۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ ط (۲: ۱۶۵) یعنی مومنوں کی شناخت یہ ہے کہ اُن کے قلوب میں اللہ کی محبت تمام محبتوں پر غالب ہوتی ہے یعنی اگرچہ بہ تقاضائے بشریت اِن کو بیوی بچوں اور مال و دولت سے بھی محبت ہوتی ہے، باغات محلات اور تجارتی کاروبار سے بھی محبت ہوتی ہے لیکن اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وہ اِن سب محبتوں کو قربان کر سکتے ہیں۔

اِس آیت سے ثابت ہوا کہ محبتِ الٰہی اسلامی تعلیمات کا مرکزی اور بنیادی تصور ہے جسے ہم موجودہ زمانے کی اصطلاح میں اسلامی آئیڈیالوجی (نظامِ افکار و تصورات) کہتے ہیں وہ تمام تر اِسی بنیادی عقیدہ پر مبنی ہے۔ اگر مسلمان کی زندگی محبت سے خالی ہے تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے اِس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں۔

اِس عقیدہ یا تصور کی اہمیت کا اندازہ اِس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے محبت کرنے کے حکم پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہم کو محبت کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا ہے تاکہ ہم اپنی تخلیق کی غایت کو پورا کر سکیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (۳: ۳۱)

اے ہمارے رسولؐ! آپ مسلمانوں کو مطلع کر دیں کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنے کے آرزو مند ہو تو اِس کا طریقہ یہ ہے کہ میری اتباع کرو۔ میری پیروی

کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ (خود) تم سے محبت کرنے لگے گا۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ افسوس ہے کہ علماء مسلمانوں کو محبتِ الٰہی کا درس نہیں دیتے۔ اُنہوں نے یہ راز مسلمانوں سے پوشیدہ رکھ چھوڑا ہے کہ حرم تو خود چراغِ حرم کا پروانہ ہے۔

حرم کنایہ ہے ذاتِ خداوندی سے اور چراغِ حرم کنایہ ہے مسلمان سے۔ یعنی حقیقتِ حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود مسلمانوں سے محبت کرنے کا آرزومند ہے۔ بس وہ اتنی سی بات کا منتظر ہے کہ بندے اس کے رسول صلعم کی اتباع کریں یعنی اتباع کے ذریعہ سے اِس کی طرف مائل ہوں تو وہ اُنہیں اپنا محبوب بنا لے اور اپنی رحمتوں کے دروازے اِن پر کھول دے۔

اقبالؔ نے یہ مضمون اِس حدیث سے اخذ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ بندہ اگر میری طرف ایک قدم اُٹھاتا ہے تو میں اُس کی طرف دس قدم چل کر آتا ہوں یا وہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اُس کی طرف ایک گز بڑھتا ہوں۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے جو اپنی تمام تصانیف میں مسلمانوں کو عشقِ رسولؐ کا پیغام دیا ہے اِس کی وجہ صرف یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی رو سے دین کی حقیقت عشقِ رسولؐ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اِسی مضمون کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے:۔

بس اتنی ہی حقیقت ہے ہمارے دین و ایماں کی
کہ اُس جانِ جہاں کا آدمی دیوانہ ہو جائے

تیسرا شعر۔ اقبالؔ نے شاعرانہ انداز میں اِس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ مذہبی پیشوا، معمولی باتوں پر لوگوں کو کافر بناتے رہتے ہیں۔ اِن کا یہ طرزِ عمل اس بات پر

دلالت کرتا ہے کہ وہ دین کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔

چوتھا شعر:۔ اقبالؔ کشمیری مسلمانوں کے حق میں یہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! کشمیر میں کوئی ایسا مردِ مومن پیدا ہو جائے جس کے فقر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رنگ ہو یعنی جس طرح انہوں نے بنی اسرائیل کو مصریوں کی غلامی سے نجات دلائی تھی، وہ مردِ مومن، کشمیریوں کے لئے مفید ثابت ہو۔ آمین

پانچواں شعر:۔ گہر کنایہ ہے کشمیری مسلمانوں سے اور ابرِ دلر کنایہ ہے خطۂ کشمیر سے کہتے ہیں کہ کشمیری مسلمان تو بڑی خوبیوں کے مالک ہیں اور ان میں بڑی صلاحیت مخفی ہے لیکن غلامی نے ان کی خوبیوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔۔ اس کے بعد اقبالؔ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کشمیری مسلمان آزادی سے ہمکنار ہو سکیں۔ تاکہ ان کی خوبیاں دنیا والوں پر واضح ہو سکیں۔

نوٹ:۔ ان اشعار سے واضح ہے کہ اقبالؔ کو کشمیری مسلمانوں سے کس قدر محبت تھی۔ ۱۲

۱۲

دگرگوں جہاں اِن کے زورِ عمل سے
بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے
منجّم کی تقویمِ فردا ہے باطل
گرے آسماں سے پرانے ستارے

ضمیرِ جہاں اس قدر آتشیں ہے
کہ دریا کی موجوں سے ٹوٹے ستارے
زمیں کو فراغت نہیں زلزلوں سے
نمایاں ہیں فطرت کے باریک اشارے
ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے

تمہید:۔ اس نظم میں اقبالؔ نے کشمیری مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ تغیر اور انقلاب بہم اس دنیا کا قانون ہے لہٰذا اگر وہ اس دنیا میں ترقی کے آرزومند ہیں تو انہیں جمود اور سکون کی زندگی کو ترک کرنا پڑے گا۔ گویا سب سے پہلے اپنے اندر تغیر پیدا کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد دنیا میں انقلاب برپا کرنے کی طاقت حاصل کریں اور عملاً انقلاب برپا کر کے دکھا دیں۔ اگر وہ اس اصول پر کاربند نہیں ہوں گے تو وہ غلامی کی لعنت سے نہیں نکل سکتے۔ کیونکہ آزادی بغیر جدوجہد کے حاصل نہیں ہو سکتی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ

(۱) انقلاب خود بخود پیدا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام سر سے کفن باندھ بدر و احد میں نہ آتے تو وہ انقلاب کیسے برپا ہوتا جو دنیا کی تاریخ میں کمیت اور کیفیت دونوں کے اعتبار سے عدیم المثال ہے۔

(۲) انقلاب برپا کرنے کے لئے ایک انقلابی جماعت کا وجود لازمی ہے چنانچہ سرکارِ دو عالم صلعم نے بھی ایک جماعت بنائی تھی۔

(۳) دنیا میں انقلاب برپا کرنے سے پہلے اس جماعت کا ہر فرد اپنے اندر انقلاب پیدا کرتا ہے۔ یعنی جو دستور العمل وہ دنیا میں نافذ کرنا چاہتا ہے پہلے اس کو اپنی زندگی میں نافذ کرتا ہے۔ اس دستور کے نفوذ سے فرد میں انقلاب برپا کرنے کی طاقت ہو جاتی ہے۔

(۴) جب طاقت پیدا ہو جاتی ہے تو انقلاب ایسا ہی لازمی یقینی اور ناگزیر ہو جاتا ہے جیسے بلوغت کے بعد، مرد اور عورت کی زندگی میں انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے جو انقلاب تحریک باطنی کی (INNER DRIVE) بنا پر ظہور میں آتا ہے وہ کسی شخص کے روکے رُک نہیں سکتا۔ مثلاً انسان لاکھ کوشش کرے آثارِ بلوغت کو نہیں روک سکتا۔

جب کسی قوم کے ضمیر کی گہرائیوں میں انقلاب رونما ہو جاتا ہے تو اُس قوم پر ایک قسم کی دیوانگی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور ہر فرد کے دل میں ہر وقت یہی حرص سمائی رہتی ہے کہ جو انقلاب میرے اندر برپا ہوا ہے وہی دوسروں میں بھی رونما ہو جائے۔

صحابہ کرامؓ نے چونکہ انقلابی پروگرام (قرآنِ حکیم) پر عمل کر کے اپنے اندر انقلاب پیدا کر لیا تھا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا اس کائنات میں کوئی ہستی ہمارے اوپر حکمران نہیں ہو سکتی) اس لئے ان کے اندر ایسی طاقت پیدا ہو گئی تھی کہ انہوں نے چشم زدن میں اپنے زمانے کی دونوں عظیم الشان بلکہ سب سے بڑی سلطنتوں کا تختہ الٹ دیا۔

اگر مسلمانوں کو اپنے اسلاف کے محیر العقول کارناموں میں کوئی شک ہو

تو وہ سنہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کا مطالعہ کریں۔ یہ تو اسی صدی کا واقعہ ہے کہ جب اشتراکیوں نے، انقلابی پروگرام (کمیونسٹ مینی فیسٹو) پر عمل کر کے اپنے اندر انقلاب پیدا کر لیا (جس کا خلاصہ یہ تھا کہ لینن (LENIN) کے سوا کوئی ہستی ہم پر حکمران نہیں ہو سکتی) اس لئے ان کے اندر ایسی طاقت پیدا ہو گئی کہ انہوں نے چشم زدن میں زارِ روس اور اس کی عظیم الشان سلطنت دونوں کا خاتمہ کر دیا۔

ان مثالوں سے میرا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ ہر انقلاب پسند جماعت کے لئے لازمی ہے کہ اس کے افراد پہلے اپنے اندر انقلاب پیدا کریں وہی انقلاب جو وہ خارج میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ پھر ان کی زندگی سے انقلاب خود بخود سرزد ہو گا جس طرح موسم بہار میں بلبل کے دل سے نغمہ خود بخود سرزد ہوتا ہے پھر وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ انقلاب ہی انقلابی کا اوڑھنا اور بچھونا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جب اللہ کسی جماعت کا مقصود بن جاتا ہے تو اس کا جینا اور مرنا اس کی دولت اور جائیداد، جان اور مال، نماز اور روزہ سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہو جاتا ہے اور جب تک دیوانگی کا یہ عالم طاری نہ ہو انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔

اسی لئے قرآنِ مجید نے پہلے تو مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔ اللہ کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کیا کرتا جب تک اس قوم کے افراد پہلے خود اپنے ضمیر میں انقلاب پیدا نہ کر لیں۔

اس کے بعد یہ نکتہ تلقین فرمایا کہ

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ اے رسولؐ اعلان کر دیجئے کہ میری نمازیں اور مراسم دینی اور میرا جینا اور مرنا سب اللہ ہی کے لئے ہے۔

دراصل اسلام ایک عظیم الشان انقلابی پروگرام ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دُنیا میں نہ کوئی بادشاہ باقی رہے نہ شہنشاہ، نہ نواب نہ جاگیردار، نہ ہفت ہزاری نہ پنج ہزاری، نہ سود خوار نہ سرمایہ دار، نہ زانی نہ بدکار، بلکہ ہر مرد اور عورت صرف اللہ کی اطاعت کرے اور اُس کی زمین اور دیگر نعماء سے بقدرِ ضرورت استفاع کر سکے تاکہ یہ صورت پیدا نہ ہو کہ ایک شخص تو نانِ شبینہ کو بھی محتاج ہے اور دوسرا اپنے کتّوں کو دودھ پلا رہا ہے لیکن جب مُسلمان خود ہی ملوکیت کی لعنت میں گرفتار ہو گئے، جب رہنما خود ہی رہزن ہو گئے تو پھر شکوہ شکایت سب بے سود ہے۔

اقبالؔ نے کیسی خوبصورتی کے ساتھ ہمارے زوال کی داستان صرف ایک شعر میں قلمبند کر دی ہے:-

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

پہلا شعر:- کہتے ہیں کہ اے کشمیری مسلمانوں! تم ذرا زندہ قوموں کی تاریخ کا مطالعہ تو کرو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اُنہوں نے دُنیا میں کیسے کیسے عظیم الشان انقلاب برپا کئے۔ اِس کا باعث صرف یہ ہے کہ زندہ قوم، سکون (بے عملی) کی زندگی بسر ہی نہیں کر سکتی سکون اور جمود تو مُردہ قوم کی نشانی ہے۔

نوٹ:۔ مسلمانوں نے گذشتہ چھ سات سو سال میں

(۱) نہ کوئی آلہ ایجاد کیا ہے۔
(۲) نہ کوئی جزیرہ دریافت کیا ہے۔
(۳) نہ منطق یا فلسفہ میں کوئی نیا نظام مدوّن کیا ہے۔
(۴) نہ سائنٹفک علوم میں کوئی تحقیقات کی ہے۔
(۵) نہ کوئی مشین بنائی ہے۔
(۶) اور نہ کسی اور طریقے سے اپنی زندگی کا ثبوت دیا ہے۔

اور گذشتہ تین سو سال سے تو یہ حالت ہے کہ:-

از سہ قرن ایں امتِ خوار و زبوں
زندہ بے سوز و سرورِ اندروں

یعنی عشقِ رسولؐ کے بغیر ہی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اقبالؔ نے دوسرے مصرع میں لفظ "زندہ" طنزاً استعمال کیا، دراصل اس سے ان کی مراد "مُردہ" ہے کیونکہ جس طرح تیل کے بغیر چراغ کا روشن ہونا محال ہے اسی طرح عشق کے بغیر مسلمان کا زندہ ہونا محال ہے۔

اور اب تو جمود اور تقلیدِ کور کی یہ انتہا ہے کہ مسلمان اُس نصابِ تعلیم میں بھی انقلاب گوارا نہیں کر سکتے جو حضرت عالمگیرؒ کے عہد میں ایک بزرگ ملا نظام الدین سہالوی مرحوم نے اُس زمانے کے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر مدوّن کیا تھا!!

دوسرا شعر:- اے مسلمانوں! نجومیوں کی پیشین گوئیوں پر اعتماد مت کرو کیونکہ جن ستاروں کی چال سے وہ اپنی تقویم مرتّب کرتے تھے وہ ستارے

تو بہت دن ہوئے، اجرامِ فلکی کے زُمرہ ہی سے خارج ہو چکے ہیں۔ اِس لئے قدرتی طور پر ان کی تقویم باطل ہے یعنی قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم جاہل ملاؤں اور نقلی صوفیوں کی باتوں پر اعتبار مت کرو کیونکہ جن علوم پر اُن کی قابلیت کا دار و مدار تھا وہ تو مدتوں سے ساقط عن الاعتبار ہو چکے ہیں۔ وہ علوم تو بلا مبالغہ "تقویمِ پارینہ" بن چکے ہیں پس اِن فرسودہ علوم کی مدد سے یہ لوگ تمہاری رہنمائی کا فرض انجام نہیں دے سکتے کیا راکفل کا مقابلہ، تیر و کمان سے ہو سکتا ہے۔

تیسرا شعر:- اے مسلمانوں! ملا اور صوفی جب خود اپنے اندر کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتے تو وہ تمہیں انقلاب کی دعوت کس منہ سے دے سکتے ہیں؟ لیکن میں تمہیں اِس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ انقلاب تو قانونِ فطرت ہے۔

اگر امروزِ تو، تصویرِ دوشِ است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

اِس لئے اے مسلمانوں! اگر تم دُنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہو تو انقلاب کو لازمۂ حیات یقین کرو۔ یعنی سکون اور جمود کو بکلی ترک کر دو۔

ضمیرِ جہاں اس قدر آتشیں ہے یعنی اِس کی ذات میں انقلاب کی اِس قدر زبردست صلاحیت پوشیدہ ہے کہ کبھی کبھی دریا کی موجوں سے بھی ستارے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ یعنی بعض اوقات دُنیا میں انقلاب کی محیر العقول صورتیں رونما ہو جاتی ہیں جن کو دیکھ کر انسان کی عقل دنگ ہو جاتی ہے۔

نوٹ:۔ (۱) ضمیرِ جہاں کے آتشیں ہونے اور ستاروں کے ٹوٹنے میں یہ ربط ہے کہ شہابِ ثاقب میں بھی التہابی کیفیت موجود ہوتی ہے۔

(۲) تاریخِ عالم محیر العقول واقعات سے معمور ہے۔ تیمور، قُدر، شیر شاہ، نور جہاں، نادر شاہ، نپولین، لینن، ہٹلر اور مسولینی یہ سب وہ لوگ ہیں جن کے متعلق بچپن میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آئندہ زندگی میں یہ لوگ بادشاہ بن جائیں گے۔

چوتھا شعر:- اے مسلمانوں! اگر تم حقائق کا ادراک نہیں کر سکتے تو حوادثِ روزگار ہی سے سبق حاصل کرو۔ دیکھو زمین میں ہر وقت زلزلے آتے رہتے ہیں۔ اور ہر زلزلہ انقلاب برپا کر دیتا ہے تم بھی اِس منظر سے سبق لو یہ زلزلے تمہیں زبانِ حال سے انقلاب برپا کرنے کی دعوت دیتے رہتے ہیں یعنی جس طرح فطرت، کائنات میں انقلاب برپا کرتی رہتی ہے اِسی طرح تمہارا فرض ہے کہ اپنے اندر انقلاب پیدا کرو اور پھر خارج (دنیا) میں انقلاب برپا کرو۔

پانچواں شعر:- خضر (اقبالؔ یا ہمدردِ قوم) وُلر کے کنارے یہ سوچ رہا ہے کہ دیکھئے کشمیری مسلمانوں کے اندر آزادی کے حصول کا جذبہ کب تک پیدا ہوتا ہے۔

۱۳

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروّت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں
خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں

شکوۂ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن
قبولِ حق ہیں فقط مردِ حر کی تکبیریں
حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

پہلا شعر۔ اس شعر میں دو لفظ تشریح طلب ہیں (۱) زندہ قومیں (۲) تقدیریں۔ زندہ قوموں سے یہاں اقبال کی مراد وہ قومیں ہیں جو دنیا میں حکمرانی کی طالب ہیں اور یہ جانتی ہیں کہ حکومت کے لئے عناصرِ فطرت کو مسخر کرنا ضروری ہے اور تسخیر کے لئے علم لازمی ہے پس وہ قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرتی ہیں اور اس کے بعد تسخیر کائنات کے لئے جدوجہد کرتی ہیں۔

اگر وہ کائنات کو مسخر کر کے اس میں خدا کا قانون نافذ کر دیں تو مسلمان ہو جائیں گی اور اگر ایسا نہ کریں تو کافر قرار پائیں گی لیکن اِن کا کفران کی دنیاوی ترقی میں حائل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ قانون معین کر دیا ہے کہ انسان کافر ہو یا مومن۔ اس کو اس کی کوشش کا صلہ اس دنیا میں ضرور ملے گا۔ مثلاً ایک کافر اگر اپنے درخت کو پانی دے گا اور اس کی حفاظت کرے گا تو وقتِ مقررہ پر وہ اُس درخت پر سے پھل حاصل کر سکے گا۔ اور اگر ایک مسلمان اپنے درخت کو پانی نہیں دے گا اور اس کی حفاظت نہیں کرے گا تو پھل بھی نہیں کھا سکے گا۔ اس معاملہ میں اس کا مسلمان ہونا اس کے لئے ہرگز مفید نہیں ہو سکتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ زندہ قومیں وہ ہیں جو طبعی قوانین کا علم حاصل کرنے کے بعد ترقی کے لئے جدوجہد میں مصروف ہو جاتی ہیں۔

تقدیر کی وضاحت گذشتہ اوراق میں کر چکا ہوں۔ یہاں اس قدر کافی ہے کہ تقدیر کے تین مفہوم ہیں:۔

فلسفۂ جبر میں تقدیر کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا کو پیدا کرنے سے پہلے خدا نے ہر شخص کی زندگی معین کر دی ہے بعض کو شقی بنا دیا ہے بعض کو سعید اس لئے ہر شخص مجبور ہے۔ جو شقی ہے۔ وہ اپنی کوشش سے سعید نہیں ہو سکتا، اور سعید سے بدی کا ارتکاب نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اصلاحِ حال کی کوشش بالکل بے سود ہے کیونکہ انسان خدا کے فیصلوں کو کسی صورت سے نہیں بدل سکتا۔

اقبال تقدیر کے اس مفہوم سے متفق نہیں ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ انسان مجبورِ محض نہیں ہے ورنہ پھر اس میں اور جمادات و نباتات میں کیا فرق ہوگا؟ بیشک وہ بعض معاملات میں مجبور ہے لیکن بعض میں مختار بھی ہے۔ یعنی اقبال کا مسلک اس شعر کے مطابق ہے:۔

نیست فرمودۂ سلطاں بدرا است
کہ ایماں درمیانِ جبر و قدر است

یعنی انسان مجبور بھی ہے مختار بھی ہے۔

تقدیر کے دوسرے معنی ہیں اندازہ کرنا قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ہر شئے کی تقدیر متعین کر دی ہے۔ مثلاً پتھر کی تقدیر یہ ہے کہ وہ حرکت نہیں کر سکتا۔ درخت کی تقدیر یہ ہے کہ وہ زمین سے نشوونما تو حاصل کر سکتا ہے لیکن چل نہیں سکتا۔ اسی پر دوسری اشیاء کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ خدا نے جس چیز کے لئے جو قانون مقرر کر دیا ہے اس میں تبدیلی نہیں

ہو سکتی۔ چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے:۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۔۔ تو اللہ کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ شیر ہوا میں اُڑنے لگے اور طوطا کسی چڑیا کو شکار کر لے۔ یہ مفہوم اقبال کو مسلم ہے۔ لیکن یہاں اُن کی مراد یہ نہیں ہے۔

تقدیر کا تیسرا مفہوم ہے حالاتِ زندگی، اور اقبال نے اس جگہ یہی معنی مراد لئے ہیں یعنی جس وقت کوئی قوم اپنے اندر تبدیلی پیدا کرے گی اللہ تعالیٰ اس کی تقدیر بھی بدل دے گا۔ یعنی جب کوئی قوم ترقی کے لئے جدوجہد کرے گی اللہ اس کی مدد کرے گا۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ فلاں قوم زندہ ہے یا مُردہ تو اُس کی پہچان یہ ہے کہ اگر اُس قوم کی حالت میں ہر روز تبدیلی ہوتی رہتی ہے (اس کی تقدیریں صبح و شام بدلتی رہتی ہیں) تو سمجھ لو کہ وہ زندہ ہے اور اگر تم یہ دیکھو کہ اس قوم کی زندگی میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ جس طرح۔ داوا حضور، کا فرزند کی عطا کردہ بھیک (پولیٹیکل پنشن) پر گذر کر رہے تھے اُسی طرح پوتے بھی ہر ماہ کی یکم تاریخ کو کاسۂ گدائی لے کر مہتمم خزانہ کے دفتر میں پہنچ جاتے ہیں تو سمجھ لو کہ وہ مُردہ قوم کے افراد ہیں یا اگر کسی ملک کے لوگ آج بھی موٹر کے بجائے اونٹوں پر سفر کر رہے ہیں تو سمجھ لو کہ وہ قوم مُردہ ہے۔ زندگی کا ثبوت قبّے مسمار کرنے سے نہیں ہو سکتا بلکہ مکّہ سے مدینہ تک ریل کی پٹڑی بچھانے سے اور موٹر اور ہوائی جہاز کے کارخانے اور مشین گن کی فیکٹریاں قائم کرنے سے مل سکتا ہے۔ اور جو سچ پوچھو تو امریکہ کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکنے سے ہو سکتا ہے۔

نوٹ:۔ اگر اقبال کے اس معیار کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر عرب، شام، عراق، ترکستان، ایران، افغانستان، اور پاکستان، ان تمام ممالک میں "مُردے" آباد ہیں۔ یعنی جو لوگ اِن ملکوں میں رہتے ہیں وہ دراصل مُردہ ہیں:۔

مثلاً افغانستان کے لوگ جس طرح آج سے تین سو سال پہلے سلطانی، ملائی اور پیری کی لعنت میں گرفتار تھے اسی طرح آج بھی گرفتار ہیں، جس طرح یہ لوگ بابر کے عہد میں جہالت اور تعصب اور تقلیدِ کور میں مبتلا رہے اسی طرح آج بھی یہ تینوں لعنتیں اِن کے سروں پر مسلّط ہیں۔

دوسرا شعر۔ زندہ قوموں کی دوسری شناخت یہ ہے کہ وہ سچ بولتے ہیں۔ اور دوسروں کے ساتھ بھلائی (احسان) کرتے ہیں۔ یعنی اِن میں سیرت کی وہ تمام خوبیاں موجود ہوتی ہیں جو حکمرانی یا سرداری کے لئے شرطِ اوّلین ہیں۔ اسی لئے خدا بھی اِن کی لغزشوں سے درگذر کرتا ہے اور معمولی فروگذاشتوں پر بازپُرس نہیں کرتا۔

نوٹ:۔ انگلستان اور پاکستان کے باشندوں کی سیرت کا موازنہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ:۔

(۱) جب ۱۹۴۲ء میں جرمنوں نے لندن پر بمباری کی تو جن لوگوں کے مکانات منہدم ہو جاتے تھے، ہمسائے اُن مکانات سے جو سامان برآمد ہوتا تھا اُس کی باقاعدہ فہرست بنا کر پولیس کے حوالے کر دیتے تھے اور جب تک پولیس آتی وہ خود اُس کی حفاظت کرتے تھے۔

(۲) جب ۱۹۵۵ء میں لاہور میں سیلاب آیا تو بہت سے لوگ جان بچانے

کے لئے اپنے گھروں کو مقفل کرکے دوسری جگہ چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد ہمسایوں نے ان کے "لاوارث مال" پر نہایت اطمینان سے ہاتھ صاف کیا اور اس طرح سچی اسلامی ہمدردی کا ثبوت دیا۔

دوسری مثال:۔ لندن میں اکثر اشخاص سوتے وقت اپنے جوتے دروازہ سے باہر رکھ دیتے ہیں تاکہ پالش کرنے والا جب چاہے اُنہیں صاف کر جائے اور انہی کے برابر دودھ سپلائی کرنے والا دودھ کی بوتل بھی رکھ جاتا ہے۔ لیکن پاکستان میں یہ کیفیت ہے کہ مسجدوں تک سے جوتے چوری ہو جاتے ہیں اور دودھ کی بوتل دروازہ کے باہر رکھ جانے کا تو تصور ہی دماغ میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ دودھ کی بوتل تو بڑی چیز ہے، خالی بوتل دو گھنٹے کے بعد اپنی جگہ نظر نہیں آسکتی۔ جس کو شک ہو تجربہ کرکے دیکھ لے"

تیسرا شعر:۔ جس قوم میں قلندرانہ جمال اور سکندرانہ جلال پایا جائے تو سمجھ لو کہ وہ قوم دُنیا میں کسی سے مغلوب نہیں ہو سکتی۔ بلکہ جس طرف رُخ کریگی کامیابی اور فتحمندی اس کے قدم چومے گی۔ "برہنہ شمشیر" کنایہ ہے سطوت و شوکت و شاہانہ سے۔

نوٹ:۔ انگریزوں میں جمال اور جلال کی دونوں صفت پائی جاتی ہیں چونکہ وہ ہم پر حکمراں رہیں اس لئے ہم لوگ ان کی شانِ جمال سے آگاہ نہیں ہیں ورنہ حق یہ ہے کہ اپنی قوم کے ادنیٰ فرد کے لئے انگریزوں میں ہمدردی (جمال) کا رنگ پایا جاتا ہے ذیل میں ایک مثال درج کرتا ہوں۔

کچھ عرصہ کی بات ہے کہ آزاد علاقے کے چند پٹھان بنّوں چھاؤنی سے

ایک انگریز فوجی افسر کی بیوی اور لڑکی کو اُٹھا کر لے گئے (تاکہ زرِ فدیہ کثیر تعداد میں وصول کر سکیں) چونکہ عورتیں سفید فام تھیں اور انگریزی قوم سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس لئے حکومتِ برطانیہ نے ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں اُن کو دشمنوں کے پنجہ سے رہا کرکے اس فوجی افسر کے حوالہ کر دیا اور چونکہ اس افسر کو اپنی بیوی اور بیٹی کی مفارقت سے ذہنی تکلیف ہوئی تھی اس لئے اس کو چھ ماہ کی رخصت مع تنخواہ بھی عطا کی اور جب یہ خاندان لندن پہنچا تو ایسٹ انڈیا ہاؤس میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا اور قوم نے بیس ہزار پونڈ یعنی ایک لاکھ روپے کی تھیلی میجر مذکور کی خدمت میں پیش کی تاکہ وہ اس رقم سے بیوی اور بیٹی کی آسائش کا انتظام کر سکے۔

چوتھا شعر:۔ واضح ہو کہ فرد یا قوم میں جمال و جلال کا رنگ اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب وہ فرد یا وہ قوم اپنی خودی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔ کیونکہ خودی بمنزلہ متن کتاب ہے اور یہ جمال یا جلال کی صفات بمنزلہ تفسیر و تشریح ہیں۔ یعنی کتاب ہو تو اُس کی تفسیر بھی لکھی جائے گی۔ اسی طرح خودی پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے تو اس میں صفاتِ عالیہ بھی پیدا ہو جائیں گی۔

نوٹ:۔ اس جگہ اگر کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ کیا کافر کی خودی پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک اس دُنیا میں حکومت اور سرورى کا سوال ہے ضرور پہنچ سکتی ہے۔ جو قوم بھی قوانین فطرت کا علم حاصل کرکے فطرت کو مسخر کرلے گی وہ قانونِ قدرت کے مطابق دُنیا میں سروری اور حکومت حاصل کرلے گی۔ اب اگر اس قوم کا امیر اپنے آپ کو قانونِ الٰہی کا پابند بنا لے

تو فاروقِ اعظم ہو جائے گا اور ایسا نہ کرے یعنی اللہ تعالیٰ کے قانون کے علاوہ کسی دوسرے قانون پر یا اپنے قانون پر عمل کرے تو وہ وارن ہیسٹنگز، یا ولزلی، یا کچنر بن جائے گا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خودی کی تکمیل کے بعد سروری تو یقینی ہے جس طرح بلوغت کے بعد عورت کے اندر مرد کی طرف اور مرد کے اندر عورت کی طرف میلان ناگزیر اور لابدی ہے۔

پانچواں شعر:۔ اے مسلمانو! میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ عید کے دن شہر کے مسلمان بہت ٹھاٹھ کے ساتھ، زرق برق لباس پہن کر جیبوں میں اپنی حیثیت سے زیادہ روپے ڈال کر، شاہی مسجد میں نماز پڑھنے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی دروازہ سے باہر نکلتے وقت دس بیس مسلمانوں کو پامال بھی کر دیتے ہیں۔ اور اخباروں میں نماز کی تصویروں پر یہ سُرخی بھی درج ہوتی ہے کہ شہر کی شاہی مسجد میں ایک لاکھ سے زائد فرزندانِ توحید کا اجتماع"

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ میں شکوہ عید کا منکر نہیں ہوں۔ واقعی مسلمان اس تقریبِ سعید پر کافی شان و شوکت کا اظہار کرتے ہیں اور حد سے زیادہ فضول خرچی بھی کرتے ہیں۔ لیکن میں اس حقیقت کے اعلان سے باز نہیں رہ سکتا کہ نمازیں صرف اُنہی لوگوں کی قبول ہوتی ہیں جو انسانوں کی غلامی سے آزاد ہوں۔ اور صرف اللہ کی اطاعت کرتے ہوں۔

نوٹ:۔ میری رائے میں اقبالؔ کا ملّتِ اسلامیہ پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُنہوں نے بعض اُن صداقتوں کو از سرِ نو زندہ کر دیا جن کو ہم نے

ملوکیت کے سحر سے مسحور ہو کر عالمِ بے خودی میں جہالت کی تلوار سے فنا کر دیا تھا۔ غور سے دیکھو تو یہ بات اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے کہ

ع قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں

لیکن ہم نے صدیوں سے اس بنیادی تعلیم بلکہ عظیم الشان صداقت کو صفحۂ دل سے حرفِ غلط کی طرح مٹا رکھا ہے۔ سچ کہا ہے اقبالؔ نے:۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

چھٹا شعر:۔ فلسفی یا عقل پرست انسان میرے پیغام کی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں ہو سکتا یعنی میں مسلمانوں سے یہ کہتا ہوں کہ تم اہلِ مغرب کی تقلید مت کرو۔ مغربی نظامِ تعلیم اور مغربی تہذیب دونوں تمہارے حق میں سم قاتل ہیں تم انگریزوں اور اُن کی تہذیب سے کلی اجتناب کرو۔

مبر پیشِ فرنگی حاجتِ خویش
ز طاقِ دل فرو ریز ایں صنم را

اور اس کے بجائے عشقِ رسولؐ اختیار کرو۔ کیونکہ عشقِ فرنگ سے دُنیا تو مل جائے گی لیکن دین ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اور عشقِ رسولؐ سے دین بھی ملے گا اور دُنیا بھی ملے گی۔ لیکن میری قوم کے عقل پرست مغرب زدہ اس نکتہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور میں اس معاملہ میں انہیں ایک حد تک معذور بھی سمجھتا ہوں کیونکہ عاشقوں کی زندگی اور اُن کا طریق کار، عقل پرستوں کی فہم سے یقیناً بالاتر ہوتا ہے وہ اس نکتہ کو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

کی اتباع سے ہم لوگ موجودہ زمانے میں کیسے ترقی کر سکتے ہیں ؟
میں صرف ایک بات کہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ کیوں نہ ہم ایک مرتبہ اقبال کی اس تجویز پر عمل کر کے دیکھ لیں۔

۱۴

چہ کافرانہ قمارِ حیات می بازی
کہ با زمانہ بسازی بخود نمی سازی
دگر بمدرسہ ہائے حرم نمی بینم
دلِ جنید و نگاہِ غزالی ورازی
بحکمِ مفتیٔ اعظم کہ فطرتِ ازلیست
بدینِ صعوہ حرام است کارِ شہبازی
ہماں فقیہہ ازل گفت جرّہ شاہیں را
بآسماں گروی باز میں نہ پروازی
منم کہ توبہ نہ کردم ز فاش گوئی ہا
ز بیم ایں کہ بسلطاں کنند غمازی
بدستِ ما نہ سمرقند و نے بخارا الیست
دعا بگو ز فقیراں بہ ترکِ شیرازی

پہلا شعر۔ قمارِ حیات باختن۔ لفظی معنی ہیں زندگی کو داؤ پر لگا دینا یا زندگی کی بازی ہار جانا مراد ہے۔ مقصدِ حیات میں ناکامی : با زمانہ بسازی۔ ساختن کثیر المعانی لفظ ہے یہاں مراد ہے موافقت یا مطابقت۔ یعنی تو زمانہ کے ساتھ

موافقت کرتا ہے یا زمانہ کے اقتضا پر عمل کرتا ہے : بخود نمی سازی۔ یعنی اپنی ذات کے اقتضا پر عمل نہیں کرتا :

واضح ہو کہ یہ شعر اُن اشعار میں سے ہے جن میں اقبال نے اپنا مخصوص فلسفہ قلمبند کیا ہے، جس کی وضاحت یہ ہے کہ لوگ عام طور سے دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے، زمانے سے موافقت کرتے ہیں۔ یعنی اپنے آپ کو زمانے کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ زمانہ کا رُخ دیکھ کر بات کرتے ہیں جیسے حالات دیکھے ویسا ہی طرزِ عمل اختیار کر لیا۔ مثلاً پاکستان میں ایک جماعت ہے جو قیامِ پاکستان سے پہلے مُسلم لیگ اور پاکستان دونوں کی سخت مخالف تھی۔ قائدِ اعظم مرحوم کو ہمیشہ "مسٹر جناح" لکھتی تھی اور اس کے لیڈر کی تنگ دلی کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ اُس نے علامہ اقبال مرحوم کی وفات پر اپنے رسالہ میں ایک لفظ نہیں لکھا۔ لیکن اب اُسی جماعت کے ارکان نہایت اطمینانِ قلب کے ساتھ مسٹر جناح کو قائدِ اعظم مرحوم لکھتے ہیں اور کمالِ دیانت داری کے ساتھ اپنے آپ کو پاکستان کا ہمدرد ظاہر کرتے ہیں اور بعض حضرات کی جسارت تو قابلِ داد ہے کہ وہ یہ کہتے ہوئے مطلق نہیں شرماتے کہ ہماری جماعت نے پاکستان کے قیام میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ جو چیز ۱۹۴۷ء سے پہلے اس مقدس جماعت کی نظر میں "زہر ملا ہوا حلوا" تھی وہی چیز آج "من و سلویٰ" سے بڑھ کر لذیذ ہو گئی ہے اسے کہتے ہیں "با زمانہ ساختن" یعنی

ع چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

ایسے لوگوں کا نہ کوئی دین ہوتا ہے نہ ایمان۔ نہ ان کے پاس ضمیر ہوتا ہے

نہ کوئی ضابطۂ اخلاق۔ اِن کا مقصدِ حیات صرف یہ ہوتا ہے کہ جس طرح ہو سکے دُنیا میں شہرت، دولت، عزّت اور حکومت یہ چار نعمتیں حاصل کی جائیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ طریقِ حیات اسلامی نہیں ہے بلکہ کافرانہ ہے مسلمان کا شیوہ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ زمانہ کے اقتضا پر عمل کرے بلکہ اس کا فرض تو یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے قانون پر عمل کرے خواہ زمانہ اس کا ساتھ دے یا نہ دے۔ مومن زمانہ کا پابند نہیں ہوتا۔ قرآن کا مطیع ہوتا ہے۔ چنانچہ بالِ جبریل میں اُنہوں نے اُسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے :۔

حدیثِ بے خبراں ہے، "تو با زمانہ بساز"
زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز

یعنی یہ بات ہے کہ "زمانہ کے حالات سے مطابقت پیدا کرو یا جیسا موقع دیکھو ویسی بات کرو" یہ وہ لوگ کہتے ہیں جو قرآنِ حکیم کی تعلیمات سے بے خبر ہیں میں مُسلمانوں کو یہ تلقین کرتا ہوں کہ اگر زمانہ تمہاری مرضی کے مطابق نہ چلے تو تم اُس سے جنگ کرو۔

دُنیا پرست کہتے ہیں۔ با زمانہ بساز
اقبال کہتے ہیں، با زمانہ ستیز

بس یہی بُنیادی فرق ہے۔ اسلام اور ان تمام مذاہب میں جن کی بنیاد مادہ پرستی پر ہے۔

چونکہ انگریزوں نے ہمیں اسلام کی حقیقت سے بیگانہ کر دیا۔ اِس لئے ہمارے دماغوں میں "ستیز" کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا ورنہ دو سو سال پہلے تک مسلمان "زمانہ

سازی" کے فنِ لطیف سے بالکل بیگانہ تھا۔ چنانچہ دیکھ لیجئے۔ سراج الدولہ، سلطان ٹیپو شہید، حافظ رحمت خان شہید، سید احمد صاحب شہید، ان سب مسلمانوں نے زمانہ کے اقتضا پر عمل کرنے کے بجائے اس کے خلاف جنگ کی۔ اب رہی یہ بات کہ ان چاروں کو میدانِ جنگ میں شکست ہو گئی۔ تو یہ بالکل لائقِ اعتنا نہیں ہے کیونکہ شخصیت کی بلندی کا معیار، کامیابی نہیں ہے بلکہ حق پرستی ہے۔ یعنی باطل کے مقابلہ میں سر بکف ہو کر میدان میں آ جانا کیا دُنیا میں کوئی شخص حکیم سقراط جناب مسیحؑ اور جناب حسینؓ کو ناکام کہہ سکتا ہے۔ شخصیت کا کمال فتح میں مضمر نہیں ہے بلکہ تاب مقاومت میں پوشیدہ ہے۔

مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ باطل کا مقابلہ کرے، اور اسی میں اس کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ چنانچہ امیر مینائی مرحوم نے اس شعر میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے:۔

شکست و فتح مقدر سے ہے امیر ولے
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اقبال یہ کہتے ہیں کہ زمانہ کے اقتضا پر عمل مت کرو کیونکہ یہ طریقِ زندگی کافرانہ ہے بلکہ اپنی ذات کے اقتضا پر عمل کرو۔ کیونکہ یہ طرزِ حیات مومنانہ ہے۔ اور مسلمان (خدا پرست) کا فرض یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قانون پر عمل کرے۔ خواہ اس کی جان جائے یا رہے۔ یعنی مقصودِ حیات اطاعتِ قانونِ الٰہی ہے نہ کہ حکومت یا فتحیابی۔

بخود ساختن" یہ اقبال کی مشہور اور محبوب اصطلاح ہے بلکہ ان کے

فلسفہ کی بنیاد ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے جو انہوں نے "اسرارِ خودی" میں دُنیا کے سامنے پیش کی۔ اِس کا مطلب تو اوپر لکھ چکا ہوں یعنی اپنی ذات کے اقتضا پر عمل کرنا، یا اپنی خودی کی تربیت کر کے اُسے مرتبۂ کمال تک پہنچانا۔

(۱) ذات یعنی انسانی شخصیت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی نیابت کا فریضہ انجام دے سکے۔

(۲) اِس کے لئے ضروری ہے کہ اس میں تسخیرِ کائنات کی طاقت پیدا ہو جائے اگر وہ عناصر پر حکمراں نہ ہو سکی تو نیابتِ الٰہیہ کے مقام پر کیسے فائز ہو سکتی ہے؟

(۳) یہ طاقت، عشقِ رسولؐ کی بدولت پیدا ہو سکتی ہے۔

(۴) پس مسلمان کا فرضِ منصبی، اطاعت یا اتباعِ رسولؐ ہے نہ کہ اطاعتِ بادشاہانِ زماں یا خوشامد و چاپلوسی اربابِ اقتدار۔

ع ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست

اس تشریح کے بعد شعر کا مطلب بالکل واضح ہو گیا کہ اے مسلمان اگر تو اپنی خودی کی تربیت کر کے اِس کو مرتبۂ کمال تک پہنچانے کے بجائے اربابِ حکومت کی خوشامد اور ضمیر فروشی کو شعارِ زندگی بنا لے گا تو تیری یہ طرزِ حیات، اگرچہ تجھے "سر"، "نواب"، "میجر" اور "کے بی ای" بنا دے گی لیکن دائرۂ اسلام سے بھی خارج کر دے گی۔

دوسرا شعر۔ مدرسہ ہائے حرم سے اسلامی مدارس مراد ہیں۔ اقبالؔ مسلمانانِ عالم کے روحانی اور عقلی انحطاط پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ اب کسی ملک میں نہ حضرت جنید بغدادیؒ جیسے صاحبانِ معرفت پیدا ہوتے ہیں اور نہ امام غزالیؒ

اور امام رازیؒ جیسے اربابِ عقل و حکمت۔

حضرت جنید بغدادی کا سالِ ولادت تو متحقق نہیں ہو سکا لیکن اتنا معلوم ہے کہ انہوں نے ۲۹۱ھ میں بمقام بغداد وفات پائی۔ اُن کی زندگی کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ مولانا جامی نے نفحات الانس میں پروفیسر براؤن نے ایران کی ادبی تاریخ میں پروفیسر نکلسن نے عربوں کی ادبی تاریخ میں اور پروفیسر آربری نے صوفیائے اسلام میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ حضرت جنید کا لقب سید الطائفہ ہے یعنی گروہ صوفیہ کے سردار۔ حضرت شبلیؒ اور حضرت حسین ابن منصور الحلاج انہی کے شاگرد تھے۔ ایرانی النسل تھے نہاوند میں پیدا ہوئے جوانی میں بغداد آئے اور ساری عمر اسی شہر میں بسر کردی۔ انہوں نے مدتوں تک بغداد کے تمام اکابر صوفیہ مثلاً حضرت سری سقطیؒ اور حارث محاسیؒ وغیرہما کی صحبت اُٹھائی اور علم و فضل، زہد و تقویٰ اور پاکیزگی سیرت میں وہ کمال پیدا کیا کہ ایک دن خلیفۂ بغداد نے اپنے ایک ندیم کو بے ادب کہہ دیا اُس نے کہا جناب میں تو تیس روز حضرت جنیدؒ کی صحبت میں بسر کر چکا ہوں۔ ابو العباس عطا لکھتا ہے کہ حضرت جنیدؒ علمِ تصوف میں ہمارے امام ہیں اور اس فن میں ہم اُنہی کی اقتدا کرتے ہیں۔ میری رائے میں حضرت جنیدؒ کی شہرت کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے تصوف کو بحیثیتِ فن مدوّن کیا۔

امام غزالیؒ بلاشبہ دُنیائے اسلام میں بہت بڑی عزت کے مالک ہیں۔ متاخرین نے ان کو حجۃ الاسلام کا لقب دیا ہے جو ہر طرح اِن پر زیب دیتا ہے۔ مغربی مصنفین تو ان کو دُنیائے اسلام میں سب سے بڑا انسان تسلیم کرتے ہیں۔

اور اِن کی ہمہ دانی کے معترف ہیں۔ مثلاً پروفیسر میکڈانلڈ لکھتا ہے۔ "امام غزالیؒ ہی وہ شخص ہیں جن کو مسلمان آئمہ اربعہ کا ہم پلّہ خیال کرتے ہیں۔ بلاشک فلسفہ اور الٰہیات میں وہ آگسٹن کا ہم رتبہ ہیں اور ابن رشد اور دوسرے مسلمان حکما، اِن کے سامنے طفلِ مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ علم و فضل کے لحاظ سے اگر کوئی شخص اِن کا مدِ مقابل ہو سکتا ہے تو وہ الفارابی ہے اور وہ بھی اِس وجہ سے کہ یہ فلسفی تصوف میں بھی مہارتِ تامہ رکھتا تھا"۔

امام صاحب ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں بمقام طوس (واقع ملکِ خراساں) پیدا ہوئے لیکن تعلیم نیشاپور میں حاصل کی جو اس زمانہ میں علم و فن کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ۴۸۴ھ میں امام صاحب بغداد تشریف لائے اور مدرسہ نظامیہ میں درس کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکچرار اور مدرّس کی حیثیت سے ان کو عدیم المثال کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد منطق فلسفہ اور کلام تینوں سے ان کا دل اُچاٹ ہو گیا اور ۴۸۸ھ میں بغداد اور شہرت دونوں کو خیر باد کہہ دیا۔ پہلے حج کیا پھر دمشق کے مضافات میں خلوت اختیار کی اور مجاہدہ اور مراقبہ کا سلسلہ شروع کیا۔ جب باطنی روشنی حاصل ہو گئی جسے فراستِ مومنانہ بھی کہہ سکتے ہیں تو احیاء العلوم تصنیف کی جو دُنیا کی غیر فانی کتابوں میں سے ہے۔ غالباً ۴۹۳ھ میں پھر بغداد واپس آئے اور مسندِ درس کو زینت بخشی لیکن چند سال کے بعد اپنے وطن میں خلوت کی زندگی اختیار کی اور ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء میں وفات پائی۔ تصانیف کی تعداد ستّر سے متجاوز ہے۔ جن میں احیاء العلوم، المنقذ من الضلال، مقاصد الفلاسفہ، تہافتہ الفلاسفہ اور اربعین بہت مشہور ہیں۔

اس شرح میں امام صاحب کے کارنامے بیان کرنے کی گنجائش کہاں ہے۔ صرف امام سیوطی کے اِس قول پر ختم کرتا ہوں کہ "اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص نبی ہو سکتا تو امام غزالیؒ کو یہ مرتبہ یقیناً حاصل ہو جاتا"۔

امام رازیؒ جو تصوف میں امام غزالیؒ سے کمتر ہیں لیکن فلسفہ اور کلام میں اُن سے بلند تر مرتبہ رکھتے ہیں ۵۴۴ھ میں بمقام رَے پیدا ہوئے تھے، اور اسی مناسبت سے رازی کہلاتے ہیں۔ اِن کا اصلی نام شیخ فریدالدین عطار ہے۔ چنانچہ مرشدِ رُومی لکھتے ہیں:۔

گر باستدلال کارِ دیں بُدے   فخرِ رازی رازدارِ دیں بُدے

جملہ علوم و فنون میں مہارتِ تامہ حاصل کرنے کے بعد امام صاحب نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور اس فن میں اس قدر شہرت حاصل کی کہ جب وہ گھر سے نکلتے تھے تین سو تلامذہ جلو میں چلتے تھے۔ شاہانِ وقت نے بھی اُن کی بڑی قدر و منزلت کی۔ مختصر یہ کہ خالقِ کائنات نے انہیں علم اور دولت دو نوں ہی نعمتیں عطا کر دی تھیں جو عام طور سے جمع نہیں ہوتیں۔

تصانیف میں، تفسیر کبیر، مباحثِ مشرقیہ، اساس التقدیس، شرح اشارات اور شرح سقط الزند بہت مشہور ہیں۔ امام صاحب نے ۶۰۶ھ میں وفات پائی۔

یہ سچ ہے کہ ان کی تفسیر میں فلسفہ اور کلام کے مباحث اِس کثرت سے مندرج ہیں کہ ان کے مطالعہ کے وقت انسان بعض اوقات یہ بات بالکل بھول جاتا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب پڑھ رہا ہے جس کا مقصد تزکیۂ نفوس ہے یا فلسفہ کی کوئی کتاب۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ابھی تک دنیائے

اِسلام میں دوسرا رازی پیدا نہیں ہوا۔ تفسیر جیسی بھی ہے اپنی جگہ لاجواب ہے اگر کسی کو صوفی بننا ہو تو احیاء العلوم پڑھ لے اور متکلم بننا ہو تو تفسیر کبیر کا مطالعہ کر لے۔ ۱۲

تیسرا شعر۔ کہتے ہیں کہ فطرت (ضابطۂ قوانین الٰہیہ) اس کائنات میں مفتیٔ اعظم ہے اور اس کا فتویٰ یہ ہے کہ چڑیا کے دین (ضابطۂ حیات) میں شہباز کی زندگی کے طور طریقوں کو اختیار کرنا (دوسروں کو شکار کرنا) حرام ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمان چڑیا کا مسلک اختیار کر لیں گے تو وہ نہ کبھی اپنا رزق اپنی قوتِ بازو سے حاصل کر سکیں گے۔ اور نہ انہیں دُنیا میں سربلندی نصیب ہو سکے گی۔ بس ساری عمر دوسروں کے دستِ نگر رہیں گے یعنی طاقتور اقوام کی غلامی کرتے رہیں گے۔

نوٹ ۱۔ واضح ہو کہ اہنسا کی تعلیم بظاہر بہت دلکش ہے کہ "ظالم کا مقابلہ نہ کرو اور اپنے دشمنوں سے پریم کرو" لیکن افسوس یہ ہے کہ جب تک حضرتِ انسان کی فطرت میں تبدیلی رونما نہ ہو جائے، اُس وقت تک یہ نصیحت، زینتِ قرطاس کی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آج کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو کوٹ لینے والے کو اپنا لبادہ بھی دیدے۔ اور نہ میں نے آج تک کوئی جینی ایسا دیکھا

مسٹر گاندھی نے مسلمانوں کو اسی مسلک کی دعوت دی تھی جس کا نام انہوں نے اہنسا رکھا تھا۔ مولینا محمد علی جنت آشیانی حضرت علی مرحوم، اور ڈاکٹر اعظم مرحوم تو اس فلسفہ کی خوبیوں سے آگاہ نہ ہو سکے لیکن سرحد کے ایک پٹھان نے مسلکِ گاندھیو یہ اختیار کر کے برادرانِ وطن سے "سرحدی گاندھی" کا شاندار لقب حاصل کر لیا تھا۔

جس نے اصل رقم تو بڑی چیز ہے کسی شخص کو "سود" ہی معاف کر دیا ہو۔

ممکن ہے آج سے دس بیس ہزار سال کے بعد انسانی طبائع میں ایسا انقلاب رونما ہو جائے کہ مظلوم، ظالم کے حق میں دعائے خیر کرنے لگے، موجودہ زمانہ میں تو "لَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ" ہی کا اصول قابلِ عمل بلکہ تمام عالم کا مدار علیہ نظر آتا ہے"

چوتھا شعر۔ چنانچہ دیکھ لو! اسی قضیہ (فطرت) نے شاہین کو یہ حکم دیا کہ تم ہمیشہ فضائے آسمانی میں پرواز کرو اور جہاں کہیں تمہیں کوئی تیتر، کبوتر، بٹیر، چکور یا کوئی اور پرندہ نظر آئے تو اُسے شکار کر لو۔ لیکن کوّے، چوہے، مرغی یا گلہری کی طرح زمین کی گری پڑی چیزیں مُردار یا دانہ یا روٹی کا ٹکڑا مت کھاؤ۔ کیونکہ یہ تمہاری شان کے شایاں نہیں ہے یہ تو اُن پرندوں کا کام ہے جو اپنی قوتِ بازو سے زندہ حیوانات کا شکار خوب کر سکتے ہیں۔ چنانچہ آج تک کسی شخص نے شاہین کو مُردار کھاتے نہیں دیکھا۔ وہ بھوکا مرنا گوارا کرے گا لیکن مرا ہوا پرندہ کبھی نہیں کھائے گا۔ یہ مطلب ہے اس مصرع کا:۔

با آسماں گروی، بازمین نہ پردازی

اِس مصرع کا لفظی ترجمہ مراد نہیں ہے کیونکہ شاہین ہوا کے پرندوں کا شکار نہیں کرتا بلکہ زیادہ تر تیتر اور بٹیر کا شکار کرتا ہے اور یہ پرندے زمین ہی پر ہوتے ہیں اس لئے "بازمین نہ پردازی" کا مفہوم یہ ہے کہ فطرت نے شاہین کو یہ حکم دیا ہے کہ مُردار کی طرف مائل نہ ہونا۔

اقبال چونکہ غلطی سے مسلمان کو شاہین سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے

اِس کو یہ نصیحت کی ہے (اگرچہ کوئی مسلمان اس پر عمل نہیں کرتا) کہ تم مُردار مت کھانا یعنی رشوت مت لینا، بلیک مارکیٹ مت کرنا، خیانت مت کرنا، ذخیرہ اندوزی مت کرنا کیونکہ آمدنی کی یہ سب صورتیں حرام ہیں۔

پانچواں شعر۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ دوستوں نے مجھے سمجھایا کہ اقبال دیکھو انگریزوں کی اسلام دشمنی مسلمانوں پر آشکارا مت کرو۔ ورنہ بہت گھاٹے میں رہو گے لیکن میں نے سچ بولنے سے توبہ نہیں کی۔ اگرچہ میرے دشمنوں نے چھوٹے لاٹ صاحب اور بڑے لاٹ صاحب دونوں سے میری شکایت کی لیکن مجھ پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوا۔ میں تو اپنی قوم کو (جب تک زندہ ہوں) انگریزوں بلکہ تمام دشمنانِ اِسلام کی معاندانہ روش سے آگاہ کرتا رہوں گا۔

چھٹا شعر۔ کہتے ہیں کہ نہ میرے قبضہ میں سمرقند ہے نہ بخارا جو میں اپنی قوم کو (جو میری محبوب ہے) بخش دوں۔ اس لئے میں اِس کے حق میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ اسے پھر دُنیا میں سربلندی عطا فرمائے۔

نوٹ۔ یہ شعر حافظ کے اس مشہور شعر سے ماخوذ ہے۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

یہاں ترکِ شیرازی سے محبوب مراد لیا ہے۔ لیکن مصداق میں فرق ہے۔ حافظ کا محبوب "فرد" ہے اقبال کا محبوب اس کی "قوم" ہے۔

اکبر الٰہ آبادی نے بھی اپنی قوم کے نوجوان کو دعا ہی دی ہے اور حق تو یہ ہے کہ خوب دی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ:۔

یہ اُن کا کورس کیا کم ہے کہ کچھ میں بھی کہوں اُن سے
میری جانب سے بس کالج کے لڑکوں کو دعا کہیئے

۱۵

ضمیرِ مغرب ہے تاجرانہ ضمیرِ مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ یہاں بدلتا نہیں زمانہ
کنارِ دریا خضر نے مجھ سے کہا باندازِ محرمانہ
سکندری ہو قلندری ہو یہ سب طریقے ہیں ساحرانہ
حریف اپنا سمجھ رہے ہیں مجھے خدایانِ خانقاہی
انہیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگِ آستانہ
غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمزِ آشکارا
زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے فضائے گردوں تجھے یگانہ
خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ
مری اسیری پہ شاخِ گل نے یہ کہہ کے صیاد کو رلایا
کہ ایسے پُرسوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پہ آشیانہ

پہلا شعر۔ ضمیر۔ عرفی معنی میں وہ قوت جو انسان کو بدی سے روکتی ہے لیکن یہاں اِس سے ذہنیت، افتادِ طبع یا میلانِ طبیعت مُراد ہے مغرب سے اقوامِ مغرب مراد ہیں + "تاجرانہ"۔ اقبال نے اِس لفظ کو راہبانہ کی ضد قرار دیا ہے یعنی حصولِ دُنیا کی طرف مائل + راہبانہ یعنی ترکِ دُنیا کی طرف مائل + زمانے سے

حالاتِ زندگی مراد ہیں ابھی مشرقی اقوام کی طرزِ حیات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

کہتے ہیں کہ مغربی اقوام چونکہ مادہ پرست ہیں یعنی خدا اور آخرت دونوں کی منکر ہیں۔ اس لئے ان کی ذہنیت تاجرانہ ہوگئی۔ ان کی نگاہ میں زندگی کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح ممکن ہو سکے دنیا حاصل کی جائے۔ بالفاظِ دگر ان کا مطمحِ نظر دولت اور اقتدار ہے۔ چنانچہ اقبالؔ نے اس مصرع میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ع مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

مادہ پرستی کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسان دولت کو اپنا معبود بنا لے گا جب کہ موت زندگی کے خاتمہ کا نام ہے تو ہر شخص کی قدرتی طور پر یہی خواہش ہوگی کہ موجودہ زندگی میں جس قدر ممکن ہو سکے دولت حاصل کرلی جائے تاکہ زندگی عیش و عشرت میں بسر ہو سکے۔

ع بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

مشرقی اقوام سے اقبالؔ کی مراد ہے ہندو دھرم، جین دھرم اور بودھ دھرم کے پیرو اور ان تینوں مذاہب کی تعلیمات میں جو شے مشترک ہے وہ یہ ہے کہ

ع دُنیا جسے کہتے ہیں بلا خانہ ہے

یعنی یہ دُنیا اور دُنیاوی زندگی دونوں دُکھ اور مصیبت ہیں۔

(۱) بودھ دھرم کا سارا فلسفہ ان دو لفظوں میں منحصر ہے "سردم دکھم" یعنی ساری کائنات سراسر دکھ ہے یا ساری زندگی کلفت اور دُکھ ہے

تسلسل کا دوسرا نام ہے بن نے بودھ دھرم کے اس بنیادی عقیدہ کو اس شعر میں نظم کردیا ہے۔

ہشیار ہو اے ناداں! یہ ذہن کی ہے پستی   کلفت کے تسلسل کو سمجھا ہے جو تو ہستی

چنانچہ بدھ مت کے اصول چہارگانہ اور طریق ہشت گانہ میں اسی دُکھ (کلفت) سے نجات حاصل کرنے کا پروگرام بیان کیا گیا ہے۔

اس مذہب میں نہ خدا ہے نہ رُوح۔ انسان نام ہے مادی جسم کا اور گیان کے ایک دھارے کا اور یہ گیان دھار یا شعور کا تسلسل ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ دنیا سے جس قدر بے تعلقی ہوتی جائے گی شعور کا یہ تسلسل بھی کمزور ہوتا جائے گا۔ اور جب وَیراگ کامل ہو جائے گا تو ہستی کا شعور بھی فنا ہو جائے گا۔ یہی نروان ہے اور یہی مقصودِ حیات ہے۔

(۲) جین دھرم میں اگرچہ رُوح کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن یہ رُوح (آتما) جسم کی قید میں گرفتار ہے اس لئے مقصدِ حیات یہ ہے کہ مادیات سے قطع تعلق کیا جائے تاکہ آتما انجام کار نجات حاصل کر سکے یعنی جین دھرم بھی بدھ دھرم کی طرح ترکِ دُنیا ہی کو موکش یا حصولِ مقصد کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔

(۳) ہندو دھرم میں بھی یہی تعلیم دی گئی ہے کہ آتما (رُوح) شریر (جسم) کے بندھن میں گرفتار ہے اس لئے ویراگ یا ترکِ دُنیا ہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے وسیلہ سے جیون مکتی (نجات) حاصل ہو سکتی ہے۔

ان تینوں مذاہب کی بنیادی تعلیمات کا لازمی نتیجہ ترکِ دُنیا یعنی رہبانیت ہے اور یہ زاویۂ نگاہ مغربی زاویۂ نگاہ کی ضد ہے یعنی مغربی اقوام کا مقصدِ حیات حصولِ دُنیا

ہے اور مشرقی اقوام کا مقصدِ حیات ترکِ دُنیا ہے۔

لامحالہ ان مختلف زاویائے نگاہ کے نتائج بھی مختلف ہوں گے اور اقبالؔ نے اُن کو دوسرے مصرع میں بیان کیا ہے یعنی مغربی اقوام کی زندگی میں ہر دم انقلاب رونما ہوتا رہتا ہے وہ دن رات دُنیا حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتی رہتی ہیں مشرقی اقوام کی زندگی میں کوئی انقلاب پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جب مقصدِ حیات ترکِ دُنیا ہو تو حصولِ دُنیا کے لئے جدوجہد کرنا خارج از بحث ہے۔ بالفاظِ دگر مغربی اقوام کی زندگی سراسر حرکت ہے مشرقی اقوام کی زندگی سراپا سکون ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مغربی اور مشرقی دونوں قوموں کا زاویۂ نگاہ غلط ہے۔ نہ وہ صراطِ مستقیم پر عامل ہیں، نہ یہ، چنانچہ اقبالؔ کہتے ہیں:۔

نہ مغرب اس سے بری ہے، نہ مشرق اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

دُنیا میں اسلام ہی وہ ضابطۂ حیات ہے جس نے ان دونوں زاویائے نگاہ سے دامن بچا کر تیسرا اور صحیح زاویۂ نگاہ پیش کیا ہے جسے وہ صراطِ مستقیم کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اقوامِ مغرب سے یہ کہتا ہے کہ دُنیا بُری چیز نہیں ہے اس لئے اُسے بیشک حاصل کرو۔ لیکن اس کے حصول کو مقصدِ حیات مت بناؤ۔

ع مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر

دولت اور حکومت مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ مقصود بالغرض ہیں۔ یعنی یہ دونوں ذریعہ ہیں حصولِ مقصد کا جو ان دونوں سے بالاتر ہے اور وہ یہ ہے کہ تم ان کی وساطت سے دُنیا میں اللہ کی حکومت قائم کرو جس میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا غلام یا محتاج

نہ ہو۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

اسی طرح وہ مشرقی اقوام سے کہتا ہے کہ بیشک دُنیاوی زندگی عارضی اور چند روزہ ہے۔ بیشک یہ دُنیا اس لائق نہیں کہ اس کو مقصودِ حیات بنایا جائے بیشک نجات کی فکر کرنی اشد ضروری ہے لیکن اس کی صورت یہ نہیں کہ رہبانیت اختیار کرلی جائے کیونکہ انسان کے ساتھ جسمانی ضرورتیں بھی لاحق ہیں۔ ان ضرورتوں کا پورا کرنا بھی انسان کا فرض ہے۔ اس لئے صراطِ مستقیم یہ ہے کہ دُنیا حاصل کرو پھر اُسے خدا کے لئے یا رُوح کے اعلیٰ مقاصد کے لئے قربان کردو۔ مثلاً دولت کماؤ لیکن اُسے ذاتی عیش و عشرت پر صرف کرنے کے بجائے محتاجوں پر صرف کرو۔ طاقت حاصل کرو لیکن اپنا قانون نافذ کرنے کے بجائے خدا کا قانون نافذ کرو۔ طاقت حاصل کرو لیکن اس طاقت سے کمزوروں کو مٹانے کے بجائے ظالموں کو مٹاؤ۔ وَ قِسۡ عَلٰی هٰذَا۔

مختصر یہ کہ اسلام، دین اور دُنیا دونوں کا جامع ہے۔ اُس نے جو دستور العمل پیش کیا ہے وہ نہ تو انسان کو تارک الدنیا بناتا ہے اور نہ چنگیزی سکھاتا ہے۔ بلکہ فاروقِ اعظمؓ اور صدیقِ اکبرؓ کے مرتبہ پر فائز کرتا ہے اُس نے ایسا ضابطۂ حیات دُنیا کو دیا ہے جو بیک وقت رُوح کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے اور جسمانی ضروریات بھی مہیا کرتا ہے۔ جو تصوریت اور خارجیت، عشق اور عقل، رُوح اور مادہ، ظاہر اور باطن، مذہب اور سیاست، فرد اور جماعت، دُنیا اور عقبیٰ، جمال اور جلال، ذکر اور فکر، غرضکہ انسانی شخصیت کے تمام پہلوؤں کی یکساں طور پر آبیاری کرکے اس کے

متضاد عناصر میں ایک حیرت انگیز ہم آہنگی اور ملی اتحاد پیدا کر دیتا ہے۔ اسی لئے قرآنِ مجید فرماتا ہے کہ ۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ یعنی اللہ کی نظر میں صرف اسلام ہی (الدین یعنی مکمل دستور العمل اور ضابطۂ حیات) ہے۔

دوسرا شعر۔ کہتے ہیں کہ ملوکیت (سکندری) ہو یا رہبانیت (قلندری) یہ سب طریقے غیر اسلامی ہیں۔ سکندری کنایہ ہے مغربی اقوام کے استیلا و اقتدار سے اور یہ اقتدار مظہر ہے ملوکیت کا۔ قلندری کنایہ ہے عاجزانہ یا غلامانہ زندگی سے جو نتیجہ ہے رہبانیت کا۔ اسی لئے اسلام نے ملوکیت اور رہبانیت دونوں کو مذموم قرار دیا ہے اور انسانوں کے سامنے خلافتِ الٰہیہ کا نصب العین پیش کیا ہے۔ جس میں نہ ملوکیت کی گنجائش ہے نہ رہبانیت کی۔ بلکہ انسان دنیا میں اللہ تعالیٰ کا قانون نافذ کرتا ہے یعنی وہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب ہوتا ہے اور سب انسان اللہ کے قانون کی اطاعت کرتے ہیں۔ کسی انسان کی اطاعت نہیں کرتے یعنی انسان، انسانوں کی غلامی سے نجات حاصل کر لیتا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ حقیقی معنی میں خدا پرستی کر سکتا ہے یہی غایت ہے اسلامی حکومت کی اور یہی مطلب ہے اس آیت کا وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ یعنی اے مسلمانو! دنیا میں ایسا نظامِ زندگی قائم کر دو کہ دین تمام تر اللہ ہی کے لئے ہو جائے یعنی کوئی شخص اللہ کو چھوڑ کر بندوں کی غلامی کرنے پر مجبور نہ ہو یا ہر شخص آزادی کے ساتھ اللہ کی اطاعت کر سکے۔

ملوکیت کا نتیجہ فساد فی الارض ہے اور رہبانیت کا نتیجہ مسکینی اور غلامی ہے چونکہ ان دونوں صورتوں میں انسان اللہ کی اطاعت نہیں کر سکتا اس لئے قرآنِ حکیم نے ان دونوں کو مذموم قرار دیا ہے۔

تیسرا شعر۔ خدایانِ خانقاہی، کنایہ ہے اُن نااہل لوگوں سے جو خانقاہوں اور درگاہوں میں بزرگوں کی مسندِ ارشاد پر بیٹھے ہوئے اپنی جہالت کے سبب سے اللہ کی مخلوق کو گمراہ کر رہے ہیں اور جاہل مریدوں سے نذرانے وصول کر کے دنیا ہی میں جنت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ میں چونکہ مسلمانوں کو حقیقی اسلام سے آگاہ کر رہا ہوں اِن کو یہ بتا رہا ہوں کہ "پیر پرستی" ناجائز بلکہ حرام ہے اس لئے وہ تمام نقلی پیر جو دین کے پردہ میں دنیا حاصل کر رہے ہیں، جو استخوان فروشی سے اپنے لئے سامان مہیا کر رہے ہیں جو لوگوں کو غلامی کا سبق پڑھا رہے ہیں یہ سب مجھ سے ناراض ہیں۔ اور مجھے اپنا دشمن تصور کر رہے ہیں۔ کیونکہ اُنھیں ڈر ہے کہ میرے کلام سے یعنی میری تعلیمات کے اثر سے، اُن کے آستانے کا چھپر شق ہو جائے یعنی اُن کا خانقاہی نظام باطل ہو جائے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ عیش و عشرت کی زندگی سے محروم ہو جائیں گے بلکہ اُن کو زندگی بسر کرنے کے لئے بہت جد و جہد کرنی پڑے گی۔

چوتھا شعر۔ جب کوئی قوم غلام ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ اس ناپاک زندگی کی خوگر ہو جاتی ہے تو اس قوم کے افراد اگرچہ علم بھی حاصل کرتے ہیں اور عرفان سے بھی بہرہ ور ہوتے ہیں لیکن ان کا یہ علم اور عرفان اُن کے حق میں مطلق مفید نہیں ہوتا۔ یعنی حصولِ حریت کی کوشش کے بجائے وہ لوگ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ کیا ہوا اگر ہم غلام ہیں؟ یا کیا مضائقہ ہے اگر ہمیں حکومتِ ارضی حاصل نہیں ہے؟ قضائے گردوں تو لامحدود ہے یعنی ہم اِس ناپاک دنیا کو اغیار کے حوالہ کر دیتے ہیں اور ہم دنیا کے بجائے دین اختیار کریں گے یعنی روحانیت میں

ترقی کریں گے۔

اقبالؔ نے اس شعر میں غلاموں کی نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے کہ غلامی ایسی شدید لعنت ہے کہ غلاموں کا علم بھی اِن کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۸۰۹ء میں پنجاب کے ہر قصبہ میں ایک خانقاہ موجود تھی لیکن ۱۸۴۹ء تک کسی شیخ نے اپنے مریدوں کو سکھوں کے خلاف جہاد پر آمادہ نہیں کیا بلکہ لاہور اور ملتان کی اکثر خانقاہوں میں ہر جمعرات کو رنجیت سنگھ کی درازئ عمر کے لئے دعائیں کی جاتی تھیں۔

پانچواں شعر۔ اقبالؔ نے اس شعر میں ہماری ذہنیت اور زندگی دونوں کی تصویر کھینچ دی ہے پہلے مصرع کا اندازِ بیان اس درجہ مؤثر ہے کہ اس کی تشریح لفظوں کے ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ کہتے ہیں کہ مجھے سخت افسوس ہے کہ مسلمان کے دماغ میں تقدیر کا غلط مفہوم جاگزیں ہو گیا ہے۔ یعنی اُس نے یہ سمجھ لیا کہ شقاوت اور سعادت خدا نے پیدائش سے پہلے ہی ہر انسان کے لئے معین اور مقرر کر دی ہے اس لئے جس کو اُس نے سعید بنایا ہے وہ بہر حال نیکی کرے گا اور جس کی قسمت میں شقاوت لکھ دی ہے وہ لاکھ کوشش کرے سعید نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا عملِ صالح اور جد و جہد اور کوشش سب بیکار اور بے سود ہے جو خدا چاہے گا وہی ظہور میں آئے گا۔ بندہ کا کام یہ ہے کہ ہر حال میں اپنی تقدیر پر صابر اور شاکر رہے۔

واضح ہو کہ تقدیر کا یہ غلط مفہوم مسلمانوں میں ملوکیت کی وجہ سے پیدا ہوا۔ جب بنو امیہ نے بندگانِ خدا کو اپنا غلام بنایا اور قرآنِ حکیم کے ہر قانون کی بے حرمتی بلکہ خلاف ورزی کو شعارِ زندگی قرار دیا تو جن مسلمانوں نے اُن کے اس غیر اسلامی

طرزِ عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ان بادشاہوں نے علماءِ سوء کی وساطت سے یہ نکتہ اُن کے دماغ میں جاگزیں کر دیا کہ بنو امیہ بے خطا ہیں جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ اس کی مشیت یہی ہے کہ بنو امیہ ہم پر حکمراں ہوں۔ بیشک اس وقت اسلام پر بہت بُرا وقت آن پڑا ہے لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔ انسان تو مجبور ہے اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہو گی کہ اُس نے اُن ظالموں کو ہم پر مسلط کر دیا ہے غرض کہ ان سلاطین نے مختلف طریقوں سے یہ غلط خیالات مسلمانوں کے دماغوں میں جاگزیں کر دیئے کہ جو کچھ ہو رہا ہے سب مشیتِ ایزدی کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس لئے اصلاحِ حال کی کوشش بیکار ہی نہیں ہے بلکہ غیر اسلامی اور قرآنی تعلیمات کے خلاف بھی ہے شاید اللہ ہمیں بنو امیہ کے واسطے سے سزا دے رہا ہے۔ شاید اسی میں ہمارے لئے کوئی بھلائی مضمر ہو۔ ہم تو مجبور ہیں، ہم کیا کر سکتے ہیں۔ واضح ہو کہ جبر کی یہ خالص تعلیم قرآن اور حدیث دونوں کے خلاف ہے۔ اللہ اور رسول اللہ دونوں نے ہمیں عملِ صالح بجالانے کا حکم دیا ہے۔

ملوکیت اور ملائیت کے علاوہ تیسری صدی ہجری میں غیر اسلامی تصوف بھی مختلف راستوں سے مسلمانوں کی سوسائٹی میں داخل ہو رہا تھا۔ ہزاروں شامی اور نصاریٰ اور لاکھوں ایرانی مجوسی اور ان کے علاوہ سینکڑوں یہودی، اشراقی، مشائی، فلسفی اور مختلف العقائد افراد اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ لوگ رہبانیت اور ترکِ دنیا کے تصورات اپنے ساتھ لائے اور انہوں نے عراق، شام، عراق خصوصاً کوفہ، بصرہ اور بغداد میں وہی خانقاہی نظام قائم کر دیا جو ان کے مذاہب میں مروج تھا۔ جب ہماری تفاسیر میں اسرائیلی اور غیر اسلامی روایات داخل ہو

گئیں تو ہمارا تصوف کس طرح غیر اسلامی اثرات سے محفوظ رہ سکتا تھا؟

مختصر یہ کہ سلاطین علمائے سوء اور صوفیائے سوء ان تینوں کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ

ع عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

واضح ہو کہ تقدیر کا یہ غلط مفہوم جس کی رو سے مسلمان تارک الدنیا اور تارک العمل ہو جاتا ہے، ابلیس کا پیدا کردہ ہے۔ چنانچہ وہ خود اعتراف کرتا ہے۔

ع میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا

اسلام تو سراسر عمل کا پیغام ہے اور عمل صالح کا دوسرا نام جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اور سرکارِ دو عالم کی ۲۳ سالہ زندگی عمل صالح اور جہاد فی سبیل اللہ کی زندہ تفسیر اور قرآنی تعلیمات کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ جس دین نے عمل کی اہمیت کو ہر ممکن طریق سے واضح کیا ہو حتیٰ کہ نجات کو عمل صالح پر منحصر کر دیا ہو، جب میں اس دین کے پیروؤں کو عمل سے نفور پاتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ قرآن اور حدیث کی صریح تعلیمات کی موجودگی میں جو مسلمان عمل سے بیگانہ ہے وہ لامحالہ یا تو خدا کو فریب دینا چاہتا ہے یا اپنے آپ کو فریب دے رہا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگرچہ میں اس کا فیصلہ نہیں کر سکا کہ حقیقتِ حال کیا ہے لیکن اتنا جانتا ہوں کہ یہ دونوں صورتیں مسلمان کے حق میں ہلاکت کا پیغام ہیں۔

نوٹ:۔ ترکِ دنیا اور ترکِ عمل کا نتیجہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ مراکش سے لے کر جاوا تک کسی "اسلامی" ملک کے مسلمان آزاد نہیں ہیں اور ان کی

بے چارگی اور درماندگی کا عالم یہ ہے کہ سنہ ۴۳ء میں جب انگریزوں نے بطور حفظ ما تقدم ایران کے خلاف "پولیس ایکشن" لیا تو یہ مملکت دو دن بھی مقابلہ نہ کر سکی۔ اس واقعہ کے درج کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ آج مسلمانوں کا کوئی ملک دو دن بھی اپنے دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

اس ضمن میں اس بات کا اندراج شاید فائدہ سے خالی نہ ہو کہ جب سنہ ۱۹۱۱ء میں ایرانی فوجیں مشہد کی حفاظت کے لئے طہران سے روانہ ہوئیں تو ملاؤں نے اُن کی گردنوں میں "ناد علی" حمائل کر دی اور "دعائے جوشن" لکھ کر بازو پر باندھ دی کہ اس کی برکت سے روسیوں کی گولیاں بے کار ہو جائیں گی۔ ایرانی سپاہیوں نے اس حماقت کا بڑے خلوص سے ورد کیا لیکن افسوس کہ کوئی فائدہ مرتب نہ ہوا۔ گولی کا جواب تو گولی ہی سے دیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نے مسجد میں بیٹھ کر کفار کی بربادی کے لئے دعا نہیں کی بلکہ بدر اور احد، احزاب اور خیبر میں تلوار اور تیر کا جواب تلوار اور تیر سے دیا۔ ۱۲

چوتھا شعر:۔ یہ شعر اقبال نے خالص تغزل کے رنگ میں لکھا ہے یعنی جب صیاد نے بلبل کو گرفتار کیا تو پھولوں نے صیاد سے یہ کہا کہ تو نے ناحق اس بیگناہ کو اسیرِ قفس کیا ایسے خوش گلو نغمہ خواں کا وجود ہمارے لئے کسی اعتبار سے بھی کلفت کا موجب نہیں تھا۔

لیکن اگر تغزل سے قطع نظر اس شعر میں مُرادی معنی تلاش کئے جائیں تو پھر

(۱) میری اسیری کنایہ ہے خادمِ قوم سے۔

(۲) شاخِ گل کنایہ ہے قوم سے۔

(۳) صیاد کنایہ ہے حکومت سے۔

اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جب حکومت قوم کے کسی خادم کو سیفٹی ایکٹ کی رو سے گرفتار کرتی ہے تو قوم یہ کہہ کر احتجاج کرتی ہے کہ حکومت کا یہ طرزِ عمل صحیح نہیں ہے کیونکہ اس شخص کا وجود کسی صورت سے بھی "امنِ عامہ" کے لئے مضر نہیں تھا۔

ع کہ ایسے پرسوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پہ آشیانہ

نوٹ:۔ واضح ہو کہ انگریزوں نے یہ ایکٹ رعایا کی سیفٹی کے لئے نہیں بنایا تھا بلکہ انہیں اپنی سیفٹی مدِ نظر تھی۔ یعنی جو شخص غلاموں میں حریت کے جذبات پیدا کرے، اسے آزادیٔ تقریر و تحریر سے محروم کیا جا سکے۔

سچ یہ ہے کہ ملوکیت اور جمہوریت دونوں میں حقیقی حریت مفقود ہے۔ یہ نعمت تو صرف حکومتِ الٰہیہ میں حاصل ہو سکتی ہے، لیکن اس کے قیام کی سردست کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ روس، امریکہ اور انگلستان یہ تین قومیں صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائیں تو شاید مسلمانوں کو دوبارہ اُبھرنے کا موقع مل سکے۔

۱۶

حاجت نہیں اے خطۂ گل شرح و بیاں کی
تصویر ہمارے دلِ پرخوں کی ہے لالہ
تقدیر ہے اک نام مکافاتِ عمل کا
دیتے ہیں یہ پیغام خدایانِ ہمالہ
سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ

اُمید نہ رکھ دولتِ دنیا سے وفا کی
رم اس کی طبیعت میں ہے مانندِ غزالہ

پہلا شعر:۔ خطۂ گل سے کشمیر اور باشندگانِ کشمیر دونوں مُراد ہو سکتے ہیں علیٰ ہذا لالہ سے گلِ لالہ اور کشمیری نوجوان دونوں مُراد ہو سکتے ہیں۔

پہلے معنی یہ ہیں کہ اے خطۂ کشمیر! تجھے اپنا حالِ زار بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں ہے۔ کیونکہ کشمیری نوجوانوں کی حالت ہمارے دلِ پُرخون سے مطابقت رکھتی ہے وہ بھی ہماری طرح رنج و غم میں مبتلا ہے۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ اے باشندگانِ کشمیر! تم اپنی مصیبت کی داستان مجھے مت سناؤ کیونکہ میں پہلے ہی سے واقف ہوں۔ اور اسی آگاہی کے سبب سے میرا دل گلِ لالہ کی طرح خون ہو رہا ہے۔

نوٹ:۔ کشمیر کے لوگ اپنے بچوں کو "لالہ" کہہ کر خطاب کرتے ہیں اس لئے لفظ لالہ میں صنعتِ ایہام پیدا ہو گئی ہے۔ مطلب اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ کشمیریوں کے حالِ زار پر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔

دوسرا شعر:۔ خدایانِ ہمالہ کنایہ ہے ہندو دھرم کے حکماء سے جن کو اصطلاح میں رِشی یا مُنی کہتے ہیں۔ مکافات کے لغوی معنی ہیں جزا یا بدلہ۔

اس شعر میں اقبال نے تقدیر کا وہ مفہوم رشیوں کی زبان سے بیان کیا ہے جن کو وہ صحیح سمجھتے ہیں۔ واضح ہو کہ ہندو فلسفہ میں تقدیر کا نام ہی ہے مکافاتِ عمل کا یعنی جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

اقبال اور ہندو فلسفہ میں فرق یہ ہے کہ ہندو حکماء مکافاتِ عمل کے لئے

تناسخِ ارواح کو تسلیم کرتے ہیں یعنی زید موجودہ زندگی میں جیسے اعمال کرے گا مرنے کے بعد انہی اعمال کے مطابق اس کو دوسرا قالب ملے گا۔ مثلاً زید اس زندگی میں بہت دُکھی ہے تو ہندو فلسفہ کی رُو سے۔

(۱) اُس نے پچھلی زندگی میں بُرے کام کئے تھے اس لئے اس زندگی میں اس کے "پرالبدھ" یعنی تقدیر میں سُکھ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

(۲) چونکہ وہ پچھلے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے اِس لئے وہ لاکھ کوشش کرے سزا سے نہیں بچ سکتا تقدیر نام ہے مکافاتِ عمل کا، اِس لئے تقدیر نہیں بدل سکتی۔

اقبالؔ اِس حد تک تو رشیوں سے متفق ہیں کہ تقدیر نام ہے مکافاتِ عمل کا لیکن وہ پُنر جنم یعنی تناسخِ ارواح کے قائل نہیں ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ انسان کو اس کی بداعمالیوں کی سزا اسی زندگی میں مل جاتی ہے، اِس لئے دوسرے جنم کا انتظار کرنا نہیں پڑے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص امتحان میں فیل ہو گیا تو اس لئے نہیں کہ اُس نے پچھلے جنم میں کوئی پاپ کیا تھا (جس کا عقلی ثبوت نہیں ہے)، بلکہ اس لئے کہ اُس نے کامیابی کے لئے جدوجہد نہیں کی بالفاظِ دگر اپنا وقت مطالعۂ کتب کے بجائے کافی ہاؤس، میں چائے اور سگریٹ میں ضائع کر دیا تو بروئے قانونِ مکافاتِ عمل اِس کی تقدیر میں ناکامی لکھدی گئی یعنی ہر شخص اپنی تقدیر خود بناتا ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی اس نقطہ پر آ کر اقبالؔ اور ہندو حکماء دونوں متفق ہو جاتے ہیں۔

یہ تقدیر کا وہ مفہوم ہے جسے اقبالؔ نے اپنی تمام تصانیف میں مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے اور اس کا اِن کے فلسفۂ خودی سے بہت شدید ربط اور بہت گہرا تعلق ہے کیونکہ اگر انسان اپنی تقدیر خود نہیں بنا سکتا تو پھر استحکامِ خودی بالکل

بےکار اور بے سود ہے۔ اقبالؔ نے اسرارِ خودی میں اِس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ بیشک اِنسان بعض معاملات میں مجبور ہے لیکن مادی اور رُوحانی ترقی کے باب میں مجبور نہیں ہے، اگر وہ ترقی کی کوشش کریگا تو اللہ ضرور اس کی امداد فرمائے گا۔ لیکن اِس کے لئے اطاعتِ قانونِ الٰہی شرطِ اوّلین ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار   می شود از جبر پیدا اختیار

تیسرا شعر۔ اقبالؔ کشمیری مسلمانوں کی بدنصیبی کا ماتم کرتے ہیں کہ شومیٔ تقدیر تو دیکھو! جو لوگ اِس قدر ہنرمند ہیں کہ بہترین قسم کے دوشالے تیار کرتے ہیں وہ خود موسم سرما میں برہنہ رہتے ہیں۔

چوتھا شعر۔ اے مسلمان! دُنیا سے یعنی دُنیا والوں سے وفا کی اُمید مت رکھ۔ کیونکہ دُنیا کی خاصیت یہ ہے کہ وہ کسی سے دل نہیں لگاتی اور دُنیا والے بھی کسی کے میت نہیں ہوتے اور دولت بھی کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتی۔ آج زید کے پاس ہے تو کل بکر کی آغوش میں ہے یعنی ہرنی کی طرح دولت بھی اپنے چاہنے والوں سے دُور بھاگتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے مسلمان! اگر تو آج کسی قوم کو برسرِ عروج دیکھتا ہے تو یہ مت سمجھ کہ دولت اور حکومت ہمیشہ اس کے پاس رہے گی۔ اِس لئے تو دولتمندوں پر رشک کرنے کے بجائے اپنی توجہ قانونِ الٰہی کی اطاعت پر مبذول کرتا کہ تو کامیاب ہو سکے۔

۱۷

خود آگاہی نے سکھلا دی ہے جس کو تن فراموشی
حرام آئی ہے اِس مردِ مجاہد پر زرہ پوشی

اِس شعر میں اقبالؔ نے شریعت اور طریقت دونوں کی رُوح کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مطلب بیان کرنے سے پہلے اِن دونوں لفظوں کی تشریح کر دوں تاکہ ناظرین کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ واضح ہو کہ شریعت اور طریقت دو مختلف چیزیں نہیں ہیں بلکہ دینِ اِسلام ہی کے دو پہلو ہیں یعنی ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ شریعت اِسلام کا ظاہری پہلو ہے اور طریقت اُس کا باطنی پہلو ہے۔ اب اقبالؔ کی زبان سے دونوں کی تعریف بیان کرتا ہوں۔

شرع بر خیزد ز اعماقِ حیات   روشن از نورش ظلامِ کائنات

یعنی شریعت، زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوتی ہے یعنی شریعت کا منبع خود انسانی زندگی ہی ہے، یہ خارج سے اِنسان پر مسلط نہیں ہوتی اور اس کے نُور سے کائنات کی سب تاریکیاں دُور ہو جاتی ہیں یعنی انسان کو جائز اور ناجائز یا حلال اور حرام کا علم حاصل ہو جاتا ہے یعنی شریعت، معیارِ خیر و شر ہے۔

پس طریقت چیست اے والا صفات   شرع را دیدن با عماقِ حیات

یعنی طریقت یہ ہے کہ انسان (مسلمان) کو اس بات کا یقین حاصل ہو جائے کہ واقعی شریعت اعماقِ حیات ہی سے پیدا ہوتی ہے، باہر سے نہیں آتی یعنی مُسلمان اِس حقیقت کو اپنی آنکھ سے دیکھ لے کہ شریعت کا منبع خود اس کا قلب ہے۔ اور میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ یہ دیکھنا ایک فن ہے جس کا حصول صحبتِ مُرشد یا مراقبہ پر

موقوف ہے۔ اب شعر کا مطلب لکھتا ہوں۔

اِس شعر میں دو لفظ وضاحت طلب ہیں، پہلے اِن کا مطلب لکھتا ہوں:۔

شریعت کے زاویۂ نگاہ سے خود آگاہی سے مُراد یہ ہے کہ جب مسلمان اپنی خودی کی تربیت کرتا ہے تو پہلے یہ آیت اس کے سامنے آتی ہے:۔ إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹ : ۱۱۱) بیشک خرید لیا ہے اللہ نے مومنوں سے اُن کی جانوں اور اُن کے مالوں کو جنّت کے بدلے میں پھر وہ یہ آیت پڑھتا ہے:۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ط

آپ کہہ دیجئے کہ میری نماز اور رسومِ دینی اور میرا جینا اور میرا مرنا (مختصر یہ کہ ساری زندگی) اللہ ہی کے لئے ہے جو رب ہے ساری کائنات کا۔

تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ میری یہ زندگی میری نہیں ہے بلکہ اللہ کی امانت ہے اور میں اس کا امین ہوں مالک نہیں ہوں اِس لئے وہ جس وقت حکم دے گا، اُس کی امانت اُس کے حوالہ کر دوں گا۔

طریقت کے نقطۂ نظر سے خود آگاہی کا مفہوم یہ ہے کہ جب سالک اِس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ میرا وجود، خانہ زاد نہیں ہے بلکہ اللہ کی صفات کا ظِل ہے یعنی میں اپنے وجود کا مالک نہیں ہوں بلکہ

نیاوردم از خانہ چیزے نخست
تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست

تو اس میں جہاد فی سبیل اللہ کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اِن دونوں صورتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس میں تن فروشی کی شان پیدا ہو جاتی ہے یعنی وہ مرنے سے نہیں ڈرتا۔ کیونکہ موت کا ڈر اُسی کو ہوتا ہے جو اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتا کہ میری جان، میری نہیں ہے بلکہ عطیۂ الٰہی ہے اور مالک کو اپنی ملک میں تصرف کا پورا حق حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا مومن ہمیشہ سر بکف رہتا ہے۔

غرض خود آگاہی سے تن فراموشی پیدا ہوتی ہے اور جب اِنسان موت سے بے پروا ہو جاتا ہے تو پھر وہ میدانِ جنگ میں جا کر شہادت حاصل کرنے کا مشتاق ہو جاتا ہے کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ دونوں صورتوں میں کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ اگر زندہ رہا تو غازی اور مارا گیا تو شہید۔ زرہ پوشی سے اقبال کی مراد ہے اپنی جان بچانے کی فکر کرنی لیکن مومن جب خود آگاہ ہو جاتا ہے تو پھر جان بچانے کے بجائے جان قربان کرنے میں اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔

ع چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خود آگاہی وہ صفت ہے جو مومن کو موت کے ڈر سے مخلص عطا کر کے مجاہد فی سبیل اللہ بنا دیتی ہے۔

نوٹ:۔ میرا خیال ہے کہ اقبال نے یہ شعر حضرت سمرہ ابن جندب رضی اللہ عنہ کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے کے بعد موزوں کیا ہو گا کیونکہ ان کو شہادت کا شوق اس درجہ دامن گیر تھا کہ انھوں نے ساری عمر میدانِ جہاد میں زرہ درکنار قمیص بھی زیب تن نہیں کی، ہمیشہ اپنے جسم کا بالائی حصہ عُریاں رکھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت موصوف کا حال اقبال کی نظر سے نہ گزرا ہو۔

لیکن میں نے ان کا تذکرہ اس لئے کر دیا ہے کہ ناظرین کو یہ معلوم ہو جائے کہ واقعی اقبال نے جو کچھ لکھا ہے صحیح ہے۔ خود آگاہی اِنسان کو موت کے خوف سے بے نیاز کر دیتی ہے اور یہی اِس شعر کا مطلب ہے اور اسی حقیقت کو اقبال مسلمانوں کے ذہن میں نقش کرنا چاہتے ہیں۔

۱۸

آں عزمِ بلند آور آں سوزِ جگر آور
شمشیرِ پدر خواہی بازوئے پدر آور

یہ بھی بہت بلند پایہ شعر ہے اور اس میں اقبال نے ہمیں سرداری اور حکومت حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ مطلب بیان کرنے سے پہلے بطور تمہید علم النفس کا ایک نکتہ بیان کرتا ہوں۔

واضح ہو کہ علمائے نفسیات (سایکالوجی) اس امر پر متفق ہیں۔ کہ اِنسانی شخصیت اگرچہ شے واحد ہے لیکن اِس کے تین مختلف پہلو ہیں۔

(۱) شعور یا علم (۲) احساس یا جذبہ (۳) ارادہ یا عزم

ان تینوں میں یہ رابطہ ہے کہ عزم کا تحقق جذبہ پر موقوف ہے اور جذبہ کا برانگیختہ ہونا شعور پر منحصر ہے۔ مثلاً زید کو علم ہوا کہ بکر مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو اس کے دل میں بکر کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو گا اگر جذبہ ضعیف ہے تو کسی قسم کا ارادہ اِس کے دل میں پیدا نہیں ہو سکتا لیکن اگر نفرت کا جذبہ قوی ہے تو بکر کے دل میں اِرادہ پیدا ہو گا کہ وہ زید کو نقصان رسانی سے باز رکھے اب اگر ارادہ کمزور ہے تو عمل ظہور میں نہیں آ سکتا لیکن اگر عزم بلند پیدا ہو گیا تو ضرور عمل پر

منتج ہو گا۔ اور زید اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا یعنی بکر کو اپنے راستے سے ہٹا دے گا۔

اب اِس شعر کا مطلب بیان کرتا ہوں۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے کشمیری مسلمان! اگر تو اپنے اسلاف کی طرح حکمرانی کا آرزو مند ہے تو ان کی طرح میدانِ جنگ میں فتوحات حاصل کر۔

شمشیرِ پدر کنایہ ہے حکمرانی سے اور بازوئے پدر کنایہ ہے جدال و قتال سے یعنی عمل سے۔ فتوحات کا حصول، عمل پر موقوف ہے۔ اور عمل، عزمِ بلند پر موقوف ہے۔ عزمِ بلند، سوزِ جگر (جذبۂ حصولِ حکومت پر موقوف ہے اور سوزِ جگر اس علم پر موقوف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مُسلمان کو اس دُنیا میں عزت اور اقتدار کی زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر مُسلمان دوبارہ سربلندی کے طالب ہیں تو سب سے پہلے صحیح علم حاصل کریں اور صحیح علم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مُسلمان کو دُنیا میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور خلیفہ وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرے بلکہ اس میں اتنی طاقت ہو کہ وہ ساری دُنیا کو اللہ کے قانون کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دے۔

بنو اُمیہ اور بنو عباس نے اِس صحیح علم کو دُنیا سے مٹا دیا۔ اور اس کی جگہ غیر قرآنی تصوّرات (جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے) علماء سوء کے ذریعہ اور تلوار کے زور سے اور دولت کے لالچ سے مُسلمانوں میں رائج کر دیئے۔

اِس لئے مُسلمانوں کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ قرآنِ مجید کا مطالعہ کریں تاکہ اُنہیں صحیح علم حاصل ہو سکے، اِس کے بعد وہ اپنے مقصدِ حیات میں ضرور کامیاب

ہو جائیں گے۔ اقبال نے اِسی نکتہ کو یوں بیان کیا ہے۔

پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر
بعد ازیں آساں شود تعمیرِ فکر

۱۹

غریبِ شہر ہوں میں سُن تو لے مری فریاد
کہ تیرے سینے میں بھی ہوں قیامتیں آباد
مری نوائے غم آلود ہے متاعِ عزیز
جہاں میں عام نہیں دولتِ دلِ ناشاد
گلہ ہے مجھ کو زمانے کی کور ذوقی سے
سمجھتا ہے مری محنت کو محنتِ فرہاد
"صدائے تیشہ کہ بر سنگ میخورد دگر است
خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است"

تمہید:۔ بظاہر تو یہ ایک نظم ہے لیکن دراصل اقبال نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے، اپنی قوم کے سامنے آخری مرتبہ اپنے دردِ دل کا اظہار کیا ہے۔ اُس درد کا اظہار جس نے اُنہیں کامل تیس سال تک بے چین رکھا۔ اور جس کا اظہار اُنھوں نے اپنی ہر تصنیف میں کیا ہے۔ چنانچہ بالِ جبریل میں اسی بات کو اس انداز سے ادا کیا ہے:۔

٭ صدائے تیشہ الخ، یہ شعر مرزا جانجاناں مظہر علیہ الرحمۃ کے مشہور بیاض، خریطۂ جواہر میں ملتا ہے۔

اثر کرے نہ کرے سُن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

یہ سچ ہے کہ اقبالؔ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ میں ایک مُردہ قوم میں پیدا ہوا۔ چنانچہ پیامِ مشرق میں لکھتے ہیں :۔

او چمن زادے چمن پرور دۂ
من دمیدم از زمینِ مردۂ

لیکن جب کسی شخص پر کوئی آفت نازل ہوتی ہے تو وہ بے اختیار نالہ و فریاد کرنے لگتا ہے خواہ کوئی سُننے والا موجود ہو یا نہ ہو۔ چونکہ ملّت کی تباہی اور بربادی کے مناظر نے اقبالؔ کے دل و جگر دونوں کا خون کر دیا تھا[1]۔ اِس لئے اِن کے جذبات نے "نالۂ بے اختیار" کی صورت اختیار کر لی اور وہ ساری عمر اپنی ملّت کو اپنی "نوائے غم آلود" سُناتے رہے یعنی ریت میں سے تیل نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں :۔

حضورِ ملّتِ بیضا تپیدم
نوائے دلگدازے آفریدم

جب میں اِس نظم کو تنہائی میں پڑھتا ہوں تو چپکے چپکے اقبالؔ کی کم نصیبی پر دو آنسو بہا لیتا ہوں کہ قدرت نے اُسے کس قوم میں پیدا کر دیا۔ عین اِس حالت میں میرا ذہن اِس شعر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس میں مرحوم نے اپنی حالتِ

---

[1] نوائے صبحگاہی نے جگر خوں کر دیا میرا خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے

زار کی تصویر کھینچ دی ہے :۔

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ طریقِ نے نوازی

کتنی سچی بات بیان کر دی مرحوم نے دوسرے مصرع میں! واقعی یہ طریقِ نے نوازی اقبالؔ کے کچھ کام نہ آیا۔

اِس غیر ضروری تمہید کے بعد اب نظم کا مطلب لکھتا ہوں :۔

کہتے ہیں کہ اے مُسلمانوں! یہ سچ ہے کہ میں تمہاری سوسائٹی میں ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا ہوں کیونکہ اُس بات کی طرف بُلا رہا ہوں جو تمہیں پسند نہیں ہے بلکہ جو تمہارے تصورات کے بالکل خلاف ہے لیکن تم میری فریاد تو سُن لو میں تمہیں عمل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ میری آرزو یہ ہے کہ جو آگ میرے سینہ میں سلگ رہی ہے (یعنی غمِ ملّت) وہی تمہارے سینوں میں بھی روشن ہو جائے۔ اِس لئے میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم میرا دردِ دل ایک دفعہ غور سے سُن لو۔ پھر تمہیں اختیار ہے اس کے اقتضا پر عمل کرنا یا نہ کرنا۔

اے مسلمانوں! میری یہ نوائے غم آلود میرا بہت قیمتی سرمایہ ہے۔ جواہرات اور موتیوں سے بڑھ کر۔ یاد رکھو ایسا دل جس میں قوم کی محبت ہو یعنی دلِ ناشاد، وہ دولت ہے جو دُنیا میں بہت کمیاب ہے، بلکہ

ع نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

اور یہ نوائے غم آمیز اسی دلِ غمگین سے پیدا ہوتی ہے۔ پس اے مسلمانوں! تم اس فریاد کی قدر کرو اور دل کے کانوں سے سُنو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

مجھے اپنی قوم کی کوتاہ بینی کم علمی اور کج فہمی کا شکوہ ہے کہ وہ یہ سمجھتی ہے کہ جس طرح فرہادؔ نے تسکینِ نفس کے لئے یا ذاتی منفعت کی خاطر محبت کی تھی اُسی طرح میں دُنیا حاصل کرنے کے لئے یہ سارے جتن کر رہا ہوں میں خدمتِ قوم کے پردہ میں ہوسِ جاہ چھپائے ہوئے ہوں یا شاعری کے ذریعہ سے شہرت عزت اور دولت حاصل کرنی چاہتا ہوں۔

میں اپنی قوم کو بتانا چاہتا ہوں کہ میری شاعری یا میرا پیغام "تیشہ و سنگ" کا مصداق نہیں ہے بلکہ "تیشہ و جگر" کا مصداق ہے۔ یعنی فرہاد کی طرح میرا مقصودِ حیات "عورت" یا استعلائے نفس یا ذاتی سربلندی نہیں ہے۔ فرہاد نے جو کچھ کیا وہ اپنے نفس کی تسکین کے لئے کیا یا اپنی ذات کے لئے کیا۔ ساری محنت اپنے لئے کی اور میں نے جو کچھ محنت کی ہے یعنی میری شاعری کا مقصد اپنی ذات کو نفع پہنچانا نہیں ہے بلکہ قوم کو بیدار کرنا ہے۔

اے مُسلمانوں! جو آواز ضربِ تیشہ کی بدولت پتھر سے نکلتی ہے وہ بہت مختلف ہوتی ہے اُس آواز سے جو ضربِ تیشہ کی بدولت جگر سے نکلتی ہے۔ فرہادؔ نے پتھر پر تیشہ مارا تھا۔ لیکن میں اپنے جگر پر ضرب لگا رہا ہوں۔

اگر ان دونوں باتوں میں (پتھر اور جگر میں) فرق ہے تو پھر ضرب کے نتائج میں بھی فرق ہوگا۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تم مجھے اور فرہادؔ دونوں کو ایک ہی خانہ میں رکھتے ہو! وہ عورت کا دیوانہ تھا۔ میں شمعِ ملّت کا پروانہ ہوں۔ اُس نے عورت کے عشق میں پہاڑ کھود ڈالا۔ لیکن میں نے اپنی قوم کی محبت میں خود

اپنے آپ کو فنا کر دیا۔

ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

نوٹ :۔ علّامہ اقبالؔ نے اس نظم میں حضرت مرزا جانِ جاناں مظہرؒ کے ایک شعر پر تضمین کی ہے۔ حضرت موصوف الصدر کو عام طور سے اِس زمانہ کے لوگ صرف ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں اس لئے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت موصوف دراصل سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کے بہت بڑے بزرگوں میں سے ہیں۔ سالِ ولادت سنہ ۱۱۱۱ھ / ۱۷۰۰ء ہے حضرت سید نور محمد صاحب بدایونیؒ کے خلیفہ ہیں اور حضرت شاہ غلام علی بٹالوی کے مرشد ہیں۔ حضرت موصوف علومِ ظاہری اور باطنی دونوں میں بہت بلند پایہ مقام رکھتے تھے سنہ ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۰ء میں محرم کی دسویں تاریخ ایک شیعہ نے قرابین کے ذریعہ سے شہید کرا دیا۔ کیونکہ حضرت موصوف مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ ماتم کرنے کے بجائے "یزید" کا مقابلہ کرو۔

سر اکبر حیدری صدرِ اعظم حیدر آباد دکن کے نام

"یومِ اقبالؔ" کے موقعہ پر توشہ خانۂ حضور نظامؔ کی طرف سے جو صاحب صدرِ اعظم کے ماتحت ہے ایک ہزار روپیہ کا چیک بطور تواضع موصول ہونے پر

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حُسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات

میں تو اِس بارِ امانت کو اُٹھاتا سرِ دوش
کارِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اِس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

تمہید :- ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو (حضرت علاّمہ کی وفات سے ۳ ماہ پہلے) ہندوستان کے طول و عرض میں "یومِ اقبال" منعقد کیا گیا تھا۔ اِس موقع پر سر اکبر حیدری صدرِ اعظم ریاست حیدر آباد آنجہانی نے ایک ہزار روپیہ کا چیک سرکاری توشہ خانہ کی طرف سے علاّمہ مرحوم کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک خط بھی لکھا تھا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ یہ رقم اگرچہ شاہی توشہ خانہ کی طرف سے بھیجی گئی ہے لیکن اِس کے بھجوانے میں میری ذاتی کوشش کو بھی بڑی حد تک دخل ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اقبالؔ اِس کے جواب میں صدرِ اعظم کو شکریہ کا خط لکھیں، لیکن افسوس کہ اس کا بالکل اُلٹا نتیجہ نکلا۔

حضرت علاّمہ نے وہ چیک واپس کر دیا اور اس خط کے جواب میں یہ نظم لکھ کر بھیج دی۔

کیا خدا کی شان ہے، اور کیا انقلابِ روزگار ہے! آج نہ چیک بھجوانے والا زندہ ہے، نہ اِس کا واپس کرنے والا ہم میں موجود ہے، نہ وہ ریاست باقی ہے نہ اس کا نظام باقی ہے۔ نہ توشہ ہے نہ توشہ خانہ صرف ایک "راج پرمکھ" باقی رہ گیا ہے جو اپنی عمر کے اِس آخری دَور میں انواع و اقسام کی ذلتیں اپنے ساتھ لیجانے کے لئے جمع کر رہا ہے۔ ۱۲

مطلب :- یہ نظم اقبالؔ کی قوتِ تخیل کی کرشمہ سازی ہے۔ اربابِ علم جانتے کہ یہ وہ قوت ہے جس کی بدولت شاعر ایک بات کو متعدد طریقوں سے ادا کر سکتا ہے۔ یعنی ایک رنگ کے مضمون کو سَو رنگ سے باندھ سکتا ہے۔ اگر رموز و کنایات کے پردے ہٹا دیئے جائیں تو مطلب یہ ہے کہ صدرِ اعظم نے فرمان جاری کیا کہ اقبالؔ کو ایک ہزار کا گرانقدر عطیہ (شکوہِ پرویز) بھیجا جائے کیونکہ وہ بہت مفلس ہے اور اس لئے ہماری نظرِ کرم کا محتاج ہے۔ چنانچہ موصوف نے مجھ مردِ بے نوا (قلندر) کو لکھا کہ اس رقم سے خوب عیش کر بلکہ یہ رقم اِس قدر کثیر ہے کہ عیش و عشرت کے جملہ لوازم اِس کی بدولت مہیا ہو سکتے ہیں۔ (شہنشاہی کرا نیز ہم تجھ سے یہ توقع کرتے ہیں کہ تو اس کو اس بھدگی کے ساتھ صرف کرے گا کہ یہ رقم خطیر کبھی ختم نہ ہو گی یعنی اِس کو ثبات حاصل ہو جائے گا۔

چونکہ میں درویش صفت آدمی ہوں اور غیروں کی کڑوی باتوں کو شربت کے گھونٹ سمجھ کر پی جاتا ہوں، اِس لئے ممکن تھا کہ میں اِس گرانقدر عطیہ (بارِ امانت) کو قبول کر لیتا۔ لیکن اِس عطیہ کے ساتھ صدرِ اعظم نے خط میں یہ بھی لکھا کہ "یہ رقم میرے حکم سے آپ کو بھیجی جاتی ہے" یعنی میری خدائی کی زکوٰۃ ہے اس لئے میری خود داری (غیرتِ فقر) نے مجھ سے کہا کہ اقبالؔ! فقر و فاقہ میں گذر کر لے لیکن صدرِ اعظم کا احسان مت اُٹھا۔ لہٰذا میں نے یہ رقم واپس کر دی۔

۲۷۱

مطلب :- یہ نظم اقبالؔ کی قوتِ تخیل کی کرشمہ سازی ہے۔ اربابِ علم جانتے کہ یہ وہ قوت ہے جس کی بدولت شاعر ایک بات کو متعدد طریقوں سے ادا کر سکتا ہے۔ یعنی ایک رنگ کے مضمون کو سَو رنگ سے باندھ سکتا ہے۔ اگر رموز و کنایات کے پردے ہٹا دیئے جائیں تو مطلب یہ ہے کہ صدرِ اعظم نے فرمان جاری کیا کہ اقبالؔ کو ایک ہزار کا گرانقدر عطیہ (شکوہِ پرویز) بھیجا جائے کیونکہ وہ بہت مفلس ہے اور اس لئے ہماری نظرِ کرم کا محتاج ہے۔ چنانچہ موصوف نے مجھ مردِ بے نوا (قلندر) کو لکھا کہ اس رقم سے خوب عیش کر بلکہ یہ رقم اِس قدر کثیر ہے کہ عیش و عشرت کے جملہ لوازم اِس کی بدولت مہیا ہو سکتے ہیں۔ (شہنشاہی کرا نیز ہم تجھ سے یہ توقع کرتے ہیں کہ تو اس کو اس بھدگی کے ساتھ صرف کرے گا کہ یہ رقم خطیر کبھی ختم نہ ہو گی یعنی اِس کو ثبات حاصل ہو جائے گا۔

چونکہ میں درویش صفت آدمی ہوں اور غیروں کی کڑوی باتوں کو شربت کے گھونٹ سمجھ کر پی جاتا ہوں، اِس لئے ممکن تھا کہ میں اِس گرانقدر عطیہ (بارِ امانت) کو قبول کر لیتا۔ لیکن اِس عطیہ کے ساتھ صدرِ اعظم نے خط میں یہ بھی لکھا کہ "یہ رقم میرے حکم سے آپ کو بھیجی جاتی ہے" یعنی میری خدائی کی زکوٰۃ ہے اس لئے میری خود داری (غیرتِ فقر) نے مجھ سے کہا کہ اقبالؔ! فقر و فاقہ میں گذر کر لے لیکن صدرِ اعظم کا احسان مت اُٹھا۔ لہٰذا میں نے یہ رقم واپس کر دی۔

حسین احمدؔ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمدؔ ایں چہ بوالعجبی است!
سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِؐ عربی است!
بمصطفےٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است!

تمہید :- اگرچہ یہ نظم غایتِ شہرت کی بناء پر محتاجِ تعارف یا تشریح نہیں ہے۔ تاہم رسماً اس قدر لکھے دیتا ہوں کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہٗ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو باڑہ ہندو راؤ دہلی میں ایک تقریر کی تھی جس میں اُنہوں نے مُسلمانوں سے یہ کہا تھا کہ موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں اِس لئے مُسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت بنالیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ مُسلمانوں کی قومیت کی بنیاد دینِ اسلام نہیں ہے بلکہ وطن ہے۔ جب مولانا کی یہ تقریر حضرت علاّمہ کی نظر سے گذری تو اُنہیں سخت ملال ہوا کہ مولانا نے عالمِ دین ہو کر یہ خلافِ اِسلام تعلیم کس طرح مُسلمانوں کے سامنے پیش کی اور کس طرح اُنہیں اِس کے قبول کرنے کا مشورہ دیا؟ کیونکہ قرآن، حدیث اور فقہ تینوں کی رُو سے مُسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ طیبہ ہے نہ کہ وطن۔